جلد ۸۶ فروری سنہ ۱۹۷۷ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	فروری ۱۹۷۷ء مطابق صفر ۱۳۹۷ھ	جلد ۸۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انتخابات کسی سنجیدہ، باشعور اور تعمیری مقاصد رکھنے والی قوم کے لیے ایک اہم اجتماعی فریضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن کے انعقاد کی غرض یہ ہوتی ہے کہ عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے ایسے حکمران چُن لیں جو نہ صرف اُن کے جان و مال، عزت و آبرو کی بخوبی حفاظت کرسکیں بلکہ اُن کی اجتماعی اُمنگوں کو بطریق احسن پروان چڑھاسکیں جنھیں وہ پیکرِ محسوس میں ڈھالنے کے شدید آرزومند ہوتے ہیں۔

ووٹ کے ذریعہ حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی انسانیت کا ایک بیش قیمت تجربہ ہے جس نے انسانیت کو اُس کرب و بلا سے بچایا ہے جس میں قومیں ناپسندیدہ فرمانرواؤں کی تبدیلی کے وقت برابر مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انتخابات بالکل منصفانہ ہوں تاکہ حکمرانوں کے معاملے میں عوام کو اپنی مرضی بروئے کار لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ انتخابات کا یہ عمل جس قدر آزادانہ ہوگا اُسی نسبت سے قوم کی سیاسی تربیت ہوگی اور اُس میں نیک و بد کی تمیز اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی

اِس کے برعکس اگر انتخابات کے اعلانات تو بڑے کرّوفر سے کیے جائیں اور ملک کا حکمران طبقہ انہیں اپنی جمہوریت نوازی کے ثبوت میں بطور روشن دلیل پیش کرے مگر اِس کے لیے وہ آزاد فضا مہیا نہ ہونے دے جس میں لوگ جبرواکراہ کے بغیر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرسکیں تو انتخابات کی ساری

کارروائیاں محض ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہیں جس سے ملک اور قوم کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ انتخاب اگر کسی قوم کے لیے سنجیدہ معاملہ نہ رہے بلکہ محض ڈھونگ کی حیثیت اختیار کر لے تو اس سے عالمی برادری میں اس قوم کی ساکھ گر جاتی ہے۔ چنانچہ جن آمرانہ حکومتوں کے تحت انتخابات کا ناٹک رچا کر ایک خاص گروہ کو مسندِ اقتدار پر چپکا دیا جاتا ہے وہاں نہ تو جمہوری اداروں کو استحکام نصیب ہوتا ہے اور نہ بیرون ملک کوئی شخص ان کی جمہوریت پسندی پر یقین کر کے ان کا احترام کرتا ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ برسرِاقتدار طبقہ حکومت تو دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے لیکن لوگوں کو فریب دینے کی غرض سے انتخابات کا تماشہ دکھا رہا ہے۔ پھر اس طبقہ کے بارے میں لوگوں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ عوام میں اپنی مقبولیت اور وقار کھو چکا ہے اس لیے اسے یہ خوف لاحق ہے کہ اگر عوام کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی تو وہ لازمی طور پر اس کے خلاف ہی فیصلہ دیں گے۔ اس وجہ سے وہ ووٹ کے صحیح استعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ انتخابات کے معاملے میں کسی گروہ کی دھاندلی اس کے احساسِ شکست کی علامت ہوتی ہے۔ اس سے ملک میں حکمران طبقے کے خلاف شدید نفرت پھیل جاتی ہے۔ واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ جن حکمرانوں نے ناجائز ہتھکنڈوں کی مدد سے انتخابات جیتنے کی کوشش کی یا اپنی بداعمالیوں کے پیشِ نظر اس قومی احتساب سے خوفزدہ ہو کر اسے ٹالنے پر زور دیا انہیں جلد ہی عوامی غیظ و غضب کا نشانہ بن کر مسندِ اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جس طرح کے انتخابات منعقد ہوتے رہے اور انگریز نوکر شاہی کے ذریعے اپنی پسند کے جاگیرداروں کو مسندِ اقتدار پر براجمان کرنے کے لیے جو چالیں چلتا رہا اُن سے پوری دنیا واقف ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ غیر ملکی سامراج اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے اس طرح کی غیر اخلاقی کارروائیاں کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن ہم اسے پاکستان کا سب سے بڑا المیہ سمجھتے ہیں کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد بھی یہاں کے عوام کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ حکومت کے ایوانوں میں اپنی پسند کے نمائندے بھیج سکیں۔

مرحوم لیاقت علی خان جن پر منصفانہ انتخابات منعقد کرانے کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اُن سے اس باب میں کوتاہی سرزد ہوئی۔ اگر وہ ایک دو مرتبہ پوری خود اعتمادی اور عزم سے کام لیتے ہوئے اس میدان میں نہایت اچھی روایات قائم کر دیتے تو پھر جمہوریت کو صحیح خطوط پر نشوونما پانے کے لیے زبردست سہارا ملتا۔ مگر افسوس وہ بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت یہ کام سرانجام نہ دے سکے جس سے ملک میں جمہوریت کی مٹی پلید ہونا شروع ہوئی۔

نوابزادہ لیاقت علی کے بعد یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار پر فائز ہوا، اُس نے سازشوں کی مدد سے یہ مرتبہ حاصل کیا۔ ملک غلام محمد سیاسی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بنا۔ اس نے جمہوری اصولوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے کی کوشش کی اور مختلف حیلوں، بہانوں سے بلکہ چیرہ دستیوں سے کام لے کر اِن انتخابات کو التوا میں ڈالا اور کسی اخلاقی، قانونی اور آئینی جواز کے بغیر محض اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر دستور ساز اسمبلی کو توڑ ڈالا۔ اِس بے بصیرت شخص نے صرف اپنی طاقت کے زعم میں اِس سنگین اقدام کے نتائج سوچے بغیر یہ سب کچھ اِس غلط مفروضہ کی بنا پر کر ڈالا کہ اِس سے اُس کا دورِ اقتدار طویل ہو گا اور یہ انتہائی غیر دانشمندانہ قدم اُٹھاتے ہوئے اُس نے ان خرابیوں پر غور کرنا گوارا نہ کیا جنہیں اِس قسم کے مجنونانہ اقدام بالعموم جنم دیتے ہیں۔ اِس شخص کے برسرِ اقتدار آنے سے پیشتر بھی ملک کی سیاسی فضا آمرانہ رجحانات سے کسی حد تک مکدّر تھی، لیکن اِس کے جمہوریت کُش عمل کی وجہ سے اس فضا پر تیرگی کے مہیب بادل چھا گئے جن کی آستینوں سے پیہم ایسی بجلیاں گرتی رہیں جنہوں نے عوام کے تصورِ آزادی اور اُن کے انسانی حقوق کو بالکل غارت کر کے رکھ دیا۔

اس بگڑے ہوئے مزاج کے آمر نے ملک کے ڈیفنس سیکرٹری اور فوج کے سربراہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران اور دوسری نوکر شاہی کی مدد سے جو چاہا ہر قسم کے احتساب سے بے نیاز ہو کر کیا جس سے ملک بڑی سرعت کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھنے لگا، لیکن اس نے اپنی غلط بخشیوں کی مدد سے خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کا ایسا مضبوط ٹولہ تیار کر لیا جو اُس کے ہر قول و فعل پر، خواہ وہ دینی اور قومی نقطۂ نظر سے کتنا ہی ناپسندیدہ ہوتا، تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانے پر تیار رہتا۔ یہی وہ ٹولہ تھا جس نے دستور ساز اسمبلی توڑنے جیسے گھناؤنے جرم پر اُسے شاباش دی اور

کہہ کر اُس کی مدح و ستائش کی۔ چنانچہ ملک صاحب کی اس عاقبت نا اندیشانہ روش نے ملک میں غلط روایات قائم کیں کہ سب سے پہلے جائز و ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے ملک میں ایسی فضا قائم کی جائے جس میں مخالفت کی ہر آواز دب کر رہ جائے۔ اور اگر کوئی آواز اُٹھے تو صرف مدح و ستائش کی آواز ہو۔

جس طرح بُرائی بدی کے بطن سے جنم لیتی ہے اور بدی ہی کو معرض وجود میں لاتی ہے اسی طرح آمریت سیاسی گھٹن کی کوکھ سے نمودار ہوتی ہے اور سیاسی استبداد کا سلسلہ دراز کرتی ہے۔ چنانچہ ملک صاحب جیسے آمر کا تسلط ختم کرنے کے لیے ایک ایسا شخص آگے بڑھا جسے اپنے عہدہ کی بنا پر فوج میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا اور اپنی اس مضبوط پوزیشن کی وجہ سے محلاتی سازشوں میں نہایت مؤثر کردار ادا کر رہا تھا۔ اس نے ہمت اور جرأت کر کے اس مفلوج شخص سے اقتدار تو چھین لیا مگر اُسے اُن عوام کی طرف لوٹانے کے بجائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کا امین ٹھیرایا تھا خود اس پر بلا شرکتِ غیرے قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ اور عام آبادی کو اس کے انسانی اور جمہوری حقوق سے اسی طرح محروم رکھنے کی کوشش کی جس طرح اس کے پیشرو کے عہد حکومت میں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ عوام بیچارے کالانعام ہی رہے اور انہیں انسان سمجھ کر ان سے کوئی عزت و احترام کا معاملہ نہ کیا گیا۔ آمر چونکہ سازش کی پیداوار ہوتا ہے اس لیے عوامی تائید کی نہ تو وہ کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ اُسے اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نوکر شاہی کے اندر قوت و طاقت کے سارے مراکز پر صرف اسی کا قبضہ رہے تاکہ وہ اُن کی مدد سے مخالفین کو ٹھکانے لگا سکے۔ چنانچہ وقت کا یہ آمر سرکاری مشینری کے چند اُونچے عہدہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے اور اسی طرزِ عمل کو اپنے حق میں مفید خیال کرتا ہے اور نوکر شاہی کے مضبوط حصار کی پناہ لے کر عوام پر تابڑ توڑ حملے کر کے ان کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھیرنے اور ان کی قوت توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر مرزا نے پاکستانی فوج کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب اور حکومت کی مشینری کے چند دوسرے کل پرزوں کی مدد سے ہر وہ کام کیا جس سے ملک پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو اور مخالفت کا کوئی خفیف سے خفیف جھونکا بھی اس کی مسندِ اقتدار

کو چھوتے نہ پاتے لیکن افسوس اِن ساری حفاظتی تدابیر کے باوجود اُسے اُن لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے بہت بے آبرو ہو کر تختِ اقتدار سے الگ ہونا پڑا جنہیں وہ اپنی دانست میں اپنے لیے مضبوط پناہ گاہ سمجھ رہا تھا۔ جس شخص کی قوت کے بل بوتے پر سکندر مرزا ایک آمرِ مطلق بنا بیٹھا تھا، اُس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ جب وہ کسی دوسرے فرد کو تخت نشین کرانے کی قوت رکھتا ہے تو وہ اُسے وہاں سے ہٹا کر خود اس پر براجمان کیوں نہیں ہو سکتا۔ اسی زعم میں گرفتار ہو کر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے دستور کو کالعدم قرار دے کر پورے ملک میں مارشل لا نافذ کیا اور اس طرح ملک کو بے آئین کر دیا اور پھر محض فوج کی قوت سے عوام پر مسلط ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے لگا۔ اقتدار کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس نے اُس کی سوچ کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اُسے قطعاً یہ بات سجھائی نہ دی کہ وہ جو اقدام کر رہا ہے وہ اُس حلف کی خلاف ورزی ہے جسے اُٹھا کر وہ ایک دستور کے تحت ملک کی مسلح افواج کا سربراہ بنا ہے، اس لیے اُس کا یہ فعل صریح بغاوت کا مترادف ہے۔ اُس فوجی سربراہ نے مارشل لا نافذ کر کے عوام میں زبردست خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اِن حوصلہ شکن حالات میں بھی چند باضمیر انسانوں نے نہ صرف اس کی اس غیر قانونی جسارت پر شدید احتجاج کیا، بلکہ اِس صریح ناانصافی پر ملک کی سب سے اُونچی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر صد افسوس جج صاحب نے وقتی مصالح کی آڑ میں ایسا فیصلہ صادر کر دیا جس سے اس باغیانہ کارروائی کو سندِ جواز حاصل ہو گئی۔

فوجی حکمران اور عوام میں دس برس تک کشمکش جاری رہی۔ فوجی ڈکٹیٹر اِس انداز سے نظامِ مملکت چلانے پر زور دیتے رہے گویا قوت کا منبع اور طاقت کا سرچشمہ ان کی ذاتِ گرامی ہے، اور وہ جو کہہ دیں وہی ملک کا آئین ہے اور جو وہ کر دیں وہی دستوری روایات ہیں۔ دوسری طرف عوام اُن کی اِن آمرانہ کارروائیوں کو اپنے حقوق کی پامالی سمجھ کر انہیں مختلف طریقوں سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کشمکش نے جو مارشل لا کے نفاذ کے روزِ اوّل ہی سے شروع ہو چکی تھی، آہستہ آہستہ زور پکڑا اور حکمران صاحب عوامی دباؤ کے تحت ملک کو آئین دینے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن چونکہ وہ دستور عوامی آرزوؤں کا ترجمان نہ تھا بلکہ ایک آمر کے غیر محدود اختیارات کو تحفظ

دینے والا تھا، اس لیے عوام اُس سے کسی طرح بھی مطمئن نہ ہو سکے، اور حکمراں کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات میں مسلسل شدّت پیدا ہوتی رہی، جس نے فیلڈ مارشل کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ رائے عامہ کے علی الرغم محض انتظامیہ کی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی گردنوں پر زیادہ دیر تک مسلط رہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، اور جبر و تشدّد کا یہ عمل قوم، ملک اور خود اُن کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس حقیقت کے ادراک کے بعد وہ عوام کو ان کے چھینے ہوئے حقوق واپس کرنے پر آمادہ ہی تھے کہ ایک دو عاقبت نا اندیش سیاسی طالع آزماؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بحالیٔ جمہوریت کی یہ کشتی ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بجائے مارشل لا کی ایک دوسری خوفناک لہر کی نذر ہو کر رہ گئی، اور قوم نے دس سال کی جدّوجہد کے بعد اپنے آپ کو بے بسی اور محرومی کے اُسی مقام پر پایا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں محمد ایوب خان کے مارشل لا کے وقت حیران و ششدر کھڑی تھی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مارشل لا کے ذریعہ عنانِ اقتدار فوج کے سربراہ محمد یحییٰ خان کو منتقل کر دی۔ اس شخص نے حالات کے خشمگین تیور دیکھتے ہوئے ملک میں انتخابات منعقد کرانے کا التزام تو کیا لیکن اُن اُمڈتے ہوئے طوفانوں کی طرف قطعاً توجہ نہ دی جو اُن انتخابات کی افادیت کو برباد کرنے والے تھے۔ مارشل لا کی تیرہ فضا میں صوبہ پرستی کی تحریک نے کافی زور پکڑا اور اس وجہ سے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ ملک کے سربراہ نے اس خطرناک صورتِ حال پر غور کیے بغیر وَن یونٹ کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفرت کے دبے ہوئے جذبات لاوا بن کر پھوٹ پڑے جس نے ملک کی ساری فضا کو مسموم بنا دیا۔ ہیجان کی اس خوفناک کیفیت میں عوام نے انتخابات میں تعمیری انداز پر سوچ کر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے جذباتی نعروں میں بہ کر بعض غلط فیصلے کر دیے، جس کا بعد میں انہیں شدید احساس بھی ہوا۔ یحییٰ صاحب نے بظاہر تو ہر سیاسی جماعت کے لیے یہ بات لازمی قرار دی کہ وہ اپنا منشور اُن کے پیش کردہ دستوری ڈھانچے کے مطابق تیار کرے، لیکن اس کی پابندی کرانے میں وہ بالکل بے بس رہے، اور بعض سیاسی جماعتوں نے اس سے صریحاً انحراف کرتے ہوئے ایسے

منشور پیش کیے جو پاکستان کے بنیادی تخیل سے متاثر رکھنے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم شخصی اور وقتی مصلحتوں کے زیرِ اثر آکر انتشار کا شکار ہو گئی ۔

اِس سارے عرصہ میں مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور سابق مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کا طرزِ عمل ہر لحاظ سے ناپسندیدہ رہا ۔ اور اِن دونوں حضرات نے کوئی تعمیری کام سرانجام دینے کے بجائے عوام کے جذبات سے کھیل کر ہر قیمت پر مسندِ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اِس معاملہ میں نہ تو اُنہوں نے عوامی خواہشات کا کوئی احترام کیا اور نہ کسی صاحبِ اختیار کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھا اور بعض معاملات میں ایسا تعجب انگیز رویہ اختیار کیا جس کی آج تک کوئی معقول توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی ۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے اہم اجلاس میں بھٹو صاحب کا شریک ہونے سے معنی خیز گریز اور ایک فیصلہ کُن مرحلے پر جب مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں مصالحت کی صورت پیدا ہو رہی تھی ——— پولینڈ کی قرارداد کو چاک کر کے اجلاس سے بطور احتجاج واک آؤٹ کرنا جبکہ اُس قرار داد کو قبول کرنے کے واضح احکام مل چکے تھے ۔ پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات نے پانچ سال کے لیے مسندِ اقتدار کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا اُسے "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کا نعرہ بلند کرنے والے اِس سیاستدان نے نہ صرف پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ، بلکہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے عوامی نمائندوں کو دھمکیوں کے ذریعے قومی اسمبلی کے اجلاس میں ، جو ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا تھا ، شریک ہونے سے روک دیا ۔ اِس کے ساتھ "اُدھر تم اِدھر ہم" کا شوشہ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو یہ بات سمجھائی کہ اُن کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ ملک دولخت ہو اور جس خطّے میں اُن کی اکثریت ہے اُس میں وہ مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائیں اور مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو اُن کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے ۔

کیا یہ واقعات کسی انتہائی خود پسند ، متکبر اور آمرانہ مزاج رکھنے والی شخصیت کا پتہ نہیں دیتے ؟

تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد بھی اِس حکمران کے آمرانہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ کسی قوم کی سیاسی زندگی کا اِس سے بڑا حزنیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جمہوریت (باقی بر صفحہ ۴۵)

باب ۱۲

مکّی دَور کے آخری تین سال

اِس سے پہلے ہم حضورؐ کے سفر طائف کا ذکر کر چکے ہیں جو سنہ ۱۰ بعدِ بعثت کے اواخر میں پیش آیا تھا۔ اُس تجربے نے آپؐ کو یہ بتا دیا کہ جس طرح قریش سے اب کسی بھلائی کی توقع نہیں ہے، اسی طرح بنی ثقیف سے بھی یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کرنا تو درکنار، اُسے برداشت ہی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ بلکہ طائف میں جو ظلم آپ پر ہوا، وہ دس سال کے طویل دورِ کشمکش میں کبھی ایک دن بھی مکّے میں نہ ہوا تھا۔ اس طرح مکّے اور طائف کے لوگوں سے مایوس ہو کر آپ نے عرب کے دوسرے قبائل کی طرف توجہ فرمائی جو عُکاظ، مَجَنّہ اور ذُوالمَجَاز کے میلوں میں، اور حج کے موقع پر مِنٰی میں جمع ہوتے تھے۔ اگرچہ پہلے بھی دعوتِ عام کے لیے آپ اِن اجتماعات میں ہر قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے رہے تھے۔ لیکن اُس وقت آپ کا مقصد صرف دعوت الی اللہ پیش کرنا تھا۔ لیکن اب آپؐ نے اللہ کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ قبائل کے اَشراف اور سرداروں سے مل کر یہ بھی کہنا شروع کیا کہ تم مجھے اپنی حمایت میں لے لو اور اِس دعوت کے کام میں میری مدد کرو، کیونکہ قریش نے مجھے اللہ کے پیغامات پہنچانے سے روک دیا ہے۔ موسیٰ بن عُقبہ نے امام زُہری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مدینے کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے حضورؐ جس قبیلے سے بھی ملتے اس سے یہ فرماتے کہ "مجھے اپنے ہاں پناہ دو اور میری حمایت کرو تاکہ میں اپنے رب کا کلام پہنچاؤں"۔ اِن دَوروں میں ابوجہل اور ابولہب اور قریش کے دوسرے شیاطین برابر حضورؐ کے پیچھے لگے رہتے اور قبائل کو خبردار کرتے رہتے کہ وہ آپؐ کی بات نہ سُنیں، ورنہ گمراہ ہو جائیں گے۔ بسا اوقات یہ اشرار آپؐ کو پتھر بھی مارتے اور آپ پر خاک بھی پھینکتے تھے۔ مگر آپ کا کام جاری رہا۔ اِس کے عِلاوہ مکّے میں باہر کے کسی علاقے سے جو بااثر لوگ عُمرہ و زیارت، یا کاروبار کے سلسلے میں آتے، ان سے بھی آپ ملاقات فرماتے اور ان کے سامنے

دین کی دعوت پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی کہتے کہ تم اِس تبلیغِ حق کے کام میں میری مدد کرو اور اپنے علاقے میں مجھے لے چلو۔

وہ قبائل جن سے آپؐ ملے

اِن دَوروں کے سلسلے میں حضورؐ اکثر و بیشتر قبیلوں کے پاس گئے جن کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرقی ساحل سے لے کر مغربی ساحل تک اور جنوب سے لے کر شمال تک، کوئی طاقتور اور با اثر قبیلہ ایسا نہ تھا جس سے آپؐ نے رابطہ قائم نہ کیا ہو۔ اُن میں خاص طور پر قابلِ ذکر قبائل یہ ہیں:

۱۔ کِندَہ ۔ جنوبی عرب کا ایک بڑا قبیلہ، حضرموت سے یمن تک اس کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔

۲۔ کَلْب ۔ قُضاعہ کی ایک شاخ، جس کا علاقہ شمالی عرب میں دُومۃُ الجَندَل سے تبوک تک وسیع تھا۔

۳۔ بنی بَکر بن وائل ۔ یہ عرب کے بڑے لڑاکا قبیلوں میں شمار ہوتا تھا اور وسطِ عرب سے مشرقی ساحل تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ۳۳۰ء میں اس نے پہلی مرتبہ ایران کی حکومت سے ٹکر لی تھی، اور عہدِ رسالت میں اس کی پھر ایران سے لڑائی ہوئی جس میں ایرانی شکست کھا گئے۔ تاریخ میں یہ جنگ ذی قار کے نام سے مشہور ہے۔

۴۔ بنی البَکّاء ۔ بنی عامر بن صَعصَعہ کی ایک شاخ، جو مکہ اور سرحدِ عراق کے راستے پر آباد تھی۔

۵۔ ثَعلَبہ بن عُکابہ ۔ بنی بکر بن وائل کی ایک شاخ۔

۶۔ بنی شَیبان بن ثَعلَبہ ۔ بنی ثعلبہ بن عُکابہ کی ایک شاخ۔

۷۔ بنی الحارث بن کعب ۔ بنی تمیم کی ایک شاخ۔

۸۔ بنی حَنِیفہ ۔ بنی بکر بن وائل کی ایک شاخ جو یَمامہ میں رہتی تھی۔ مُسَیلِمہ کذاب اِسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو فتنۂ ارتداد اُٹھا تھا اُس میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ سخت مقابلہ اِسی قبیلے سے پیش آیا تھا۔ اِس کا شمار عرب کے بڑے لڑاکا قبائل میں ہوتا تھا۔

۹۔ بنو سُلَیم ۔ یہ قبائلِ قیسِ عَیلان میں سے ایک بڑا قبیلہ تھا۔ اِس کا مسکن خیبر کے قریب نجد کا بالائی علاقہ تھا، اور وادی القُریٰ اور تیماء تک یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے۔

۱۰۔ بنی عامر بن صَعصَعہ ۔ یہ ہَوازِن کی ایک شاخ تھی، اور ہوازِن قیسِ عَیلان میں سے تھے۔ یہ لوگ نجد میں رہتے تھے، پھر طائف کے ایک حصّہ تک بھی پہنچ گئے۔ گرمیاں طائف میں اور سردیاں نجد

میں گزارتے تھے۔

۱۱۔ بنی عَبس۔ یہ قیسِ عَیلان کی ایک شاخ بنی غطفان کا ایک بڑا ذیلی قبیلہ تھا۔ نجد میں رہتا تھا اور بڑے لڑاکا قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں دوسرے قبیلوں سے اِن کی لڑائیاں مدتوں چلتی رہیں جن میں سے داحِس اور غبراء کے معرکے تاریخ میں مشہور ہیں۔

۱۲۔ بنی عُذرَہ۔ یہ بنی عبداللہ بن غطفان کی ایک شاخ تھی۔

۱۳۔ غسّان۔ یہ جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم تھی جو شمالی عرب میں جا کر بس گئی تھی۔ اس میں بہت سے قبائل تھے جن میں سے کچھ عیسائی ہوگئے تھے اور کچھ مشرک تھے۔ غسانیوں کی ایک ریاست بھی رومی سلطنت کی تابع تھی۔

۱۴۔ فَزارَہ۔ یہ غطفان کے ذیلی قبائل میں سے ایک بڑا قبیلہ تھا۔ نجد اور وادی القریٰ میں آباد تھا۔

۱۵۔ بنی عبداللہ۔ یہ کلب کے ذیلی قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔

۱۶۔ بنی مُحارِب بن خَصفَہ۔ یہ عدنانی قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔

یہ اُن بہت سے قبائل میں سے چند ہیں جن سے حضورؐ اپنے اِن دَوروں میں ملے۔ یہ مختصر فہرست صرف یہ بتانے کے لیے درج کی گئی ہے کہ اپنی دعوت کے اِس مرحلے میں حضورؐ چھانٹ چھانٹ کر ایسے قبائل کے پاس تشریف لے گئے تھے جو اپنی تعداد، اپنے مقام، اپنی جنگی قوت، اور دوسرے قبائل سے اپنے تعلق کی بنا پر ایسی حیثیت رکھتے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپؐ کی بات مان لیتا اور دعوتِ اسلام کی حمایت پر کمربستہ ہوجاتا تو اُمید کی جاسکتی تھی کہ اس سے دین کو بڑی تقویت ملتی۔

قبائل کے دَوروں کی رُوداد قبائلِ عرب سے اِن ملاقاتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آیا۔ موسیٰ بن عُقبَہ نے مغازی میں لکھا ہے کہ اکثر قبائل کا جواب یہ تھا کہ "آدمی کی قوم اُس کو زیادہ بہتر جانتی ہے۔ کیا ایک ایسا شخص ہمارے لیے مفید ہوسکتا ہے جس نے خود اپنی قوم میں فساد ڈال دیا ہو اور اس کی قوم نے اُسے رَد کر دیا ہو؟" مگر بعض قبائل نے صرف انکار پر اکتفا نہ کیا، بلکہ آپؐ سے بُری طرح پیش آئے۔ ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن جریر، ابنِ ہشام اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضورؐ کِندَہ کے پڑاؤ پر گئے اور ان سے حمایت طلب کی، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بنی عبداللہ (دیکھیے اُنہ قبائلِ کلب) سے ملے اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے باپ

کو بہت اچھا نام دیا ہے، تم میرا ساتھ دو، مگر انہوں نے بھی انکار کیا۔ بنی حنیفہ کے پاس تشریف لے گئے تو اُن کا جواب دوسرے سب قبائل سے زیادہ بدتر تھا۔

اِس عام برتاؤ کے علاوہ کچھ قبائل ایسے بھی تھے جن سے حضورؐ کی ملاقات کا بڑا دلچسپ حال محدثین اور مؤرخین نے نقل کیا ہے۔

بنی ہمدان کے ایک شخص کا تردّد امام احمد، حاکم اور دوسرے متعدد محدثین نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضورؐ یہ فرماتے ہوئے جا رہے تھے کہ "کیا کوئی ہے جو مجھے اپنے ساتھ اپنی قوم میں لے جائے؟" اتنے میں قبیلۂ ہمدان کا ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور آپ کی بات قبول کر لی۔ پھر اُسے اندیشہ ہوا کہ شاید میری قوم میرا ساتھ نہ دے۔ اِس لیے وہ دوبارہ پلٹ کر آیا اور بولا کہ پہلے میں جا کر اپنی قوم سے بات کروں گا، اس کے بعد آئندہ سال زمانۂ حج میں آپ سے ملوں گا۔

بنی بکر بن وائل سے ملاقات حافظ ابو نُعیم اور یحییٰ بن سعید الاُموی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ بنی بکر بن وائل کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمہاری جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ انہوں نے کہا ہم ایران کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اُس کے مقابلے میں کسی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "ایک وقت آئے گا جب تم اُن کی منزلوں میں اُترو گے، اُن کی عورتوں سے نکاح کرو گے، ان کے بچوں کو غلام بناؤ گے۔" اس گفتگو کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے اور ابولہب وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے ان لوگوں سے کہا "یہ شخص ہمارے ہاں بڑی شان رکھتا تھا، مگر اب اِس کا دماغ چل گیا ہے۔" اُنہوں نے جواب دیا "جب اُس نے ایرانیوں کا ذکر کیا تو ہم نے بھی یہی سمجھا تھا۔" اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت کوئی عرب یہ تصوّر تک نہ کر سکتا تھا کہ کبھی ایران جیسی عظیم سلطنت پر عربوں کو ایسی فتح نصیب ہو سکتی ہے۔ اُن لوگوں کے نزدیک ایسی بات صرف ایک دیوانہ ہی کر سکتا تھا۔ لیکن اس گفتگو پر ۱۵-۱۶ برس ہی گذرے تھے کہ اُنہی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے وہی چیز دیکھ لی جس کے ذکر کو وہ دیوانگی سمجھتے تھے۔

بنی عامر بن صَعصَعَہ سے ملاقات ابن اسحاق امام زُہری کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ بنی عامر بن صَعصَعَہ کے پڑاؤ پر تشریف لے گئے اور اُن کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ اُن میں سے ایک شخص بَیحَرہ بن فراس نے کہا، خدا کی قسم، اگر قریش کے اِس جوان کو میں اپنے ساتھ لے لوں تو اِس کے ذریعہ سے تمام عرب کو

کھا جاؤں گا"۔ پھر اُس نے حضورؐ سے کہا " اگر ہم آپؐ کے کام میں آپ کا ساتھ دیں اور اللہ آپ کو مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد حکومت ہماری ہو گی؟" حضورؐ نے فرمایا " یہ معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے گا حکومت عطا کر دے گا"۔ اس پر وہ بولا " تو کیا ہم آپ کی خاطر اپنے حلق عربوں کا نشانہ بننے کے لیے پیش کر دیں اور جب اللہ آپ کو غالب کر دے تو اقتدار ہماری جگہ دوسروں کو ملے؟ جائیے، ہمیں آپ کی کوئی ضرورت نہیں"۔ حج سے فارغ ہو کر جب یہ لوگ اپنے وطن واپس گئے تو انہوں نے اپنے ایک شیخ کو، جو بڑھاپے کی وجہ سے حج اور دوسرے میلوں میں نہ جا سکتا تھا، سفر کے حالات سناتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ہمارے پاس قریش میں سے بنی عبد المطلب کا ایک نوجوان آیا تھا جو دعویٰ کرتا تھا کہ وہ نبی ہے، اور ہم سے کہہ رہا تھا کہ تم میری حمایت کرو اور مجھے اپنے علاقے میں لے چلو، مگر ہماری اُس سے یہ بات ہوئی اور ہم نے آخر کار اُسے یہ جواب دے کر واپس کر دیا۔ یہ سُن کر اُس بوڑھے نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہنے لگا " اے بنی عامر، کیا اِس کی کوئی تلافی ہو سکتی ہے؟ کیا یہ گیا ہوا موقع پھر ہاتھ آ سکتا ہے؟ اُس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کسی اسماعیلی نے ایسی بات جھوٹ گھڑ کر کبھی نہیں کہی ہے۔ یہ ضرور حق ہے۔ تمہاری عقل اُس وقت کہاں چلی گئی تھی؟"

بنی شیبان بن ثعلبہ سے ملاقات ابو نُعیمؒ، حاکم اور بیہقی نے حضرت عبد اللہؓ بن عباس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ کے ساتھ منیٰ میں قبائل کے دورے پر تھا۔ پھرتے پھراتے ہم ایک بڑی باوقار مجلس میں پہنچے جس کے مشائخ سب کے سب شاندار شخصیتوں کے مالک تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے پوچھا " آپ کون لوگ ہیں؟" انہوں نے کہا " بنی شَیبان بن ثَعلبہ میں سے ہیں"۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضورؐ سے عرض کیا " میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ان سے زیادہ معزز لوگ اور کہیں نہ ملیں گے"۔ اُس مجلس میں مَفروق بن عَمْرو، ہانی بن قَبیصہ، مُثنّیٰ بن حارثہ اور نُعمان بن شَریک موجود تھے۔ ان میں سے مفروق حضرت ابو بکرؓ کے قریب بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا " شاید آپ لوگ قریش میں سے ہیں"۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا " غالباً آپ لوگ سُن چکے ہوں گے کہ یہاں اللہ کے رسول مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ یہی ہیں"۔ مفروق نے کہا " ہاں، ہم تک یہ بات پہنچ چکی ہے"۔ پھر وہ حضورؐ کی طرف متوجہ ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: " میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم یہ شہادت دو کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور یہ کہ تم مجھے

اپنے ہاں پناہ دو اور میری مدد کرو، تاکہ میں وہ فریضہ انجام دوں جو اللہ نے میرے سپرد کیا ہے، کیونکہ قریش نے اللہ کے کام کو روکنے کے لیے ایکا کر لیا ہے، اللہ کے رسول کو جھٹلایا ہے اور حق کے بجائے باطل پر مگن ہو گئے ہیں، حالانکہ اللہ لوگوں سے بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔ مفروق نے عرض کیا "اے قریشی بھائی، آپ اور کس چیز کی دعوت دیتے ہیں"؟ حضورؐ نے آیت قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ .... ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام ۱۵۱ تا ۱۵۳) تلاوت فرمائی۔ مفروق نے کہا "اے قریشی بھائی، آپ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ خدا کی قسم یہ اہلِ زمین کا کلام نہیں ہے۔ اگر اُن کے کلام میں سے ہوتا تو ہم اُسے پہچان لیتے"۔ حضورؐ نے آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ...... (النحل۔ آیت ۹۰) سُنائی۔ مفروق نے عرض کیا "واللہ اے قریشی بھائی، آپ نے بہترین اخلاقی خوبیوں اور اعمال کی بھلائیوں کی طرف دعوت دی ہے۔ بڑی ہی بے عقل ہے وہ قوم جس نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کے خلاف ایکا کیا"۔ اس کے بعد مفروق نے ہانی بن قَبیصہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ہمارے شیخ اور مذہبی رہنما ہیں۔ ہانی نے کہا "اے قریشی بھائی، آپ کی بات میں نے سُنی اور اس کی تصدیق کی۔ لیکن ہمارا ایک ہی مجلس میں اپنا دین چھوڑ کر آپ کی پیروی اختیار کر لینا جلد بازی ہوگا۔ پیچھے ہماری قوم ہے جس کے مشورے اور رائے کے بغیر ہمارا کوئی بات طے کر کے اس پر مُسلّط کر دینا درست نہ ہوگا۔ ہم واپس جاتے ہیں، اور آپ بھی واپس جائیں، ہم بھی نتائج پر غور کریں گے اور آپ بھی دیکھیں کہ بات کہاں جا کر ٹھیرتی ہے"۔ یہ کہہ کر ہانی نے مُثنّٰی بن حارثہ کا حضورؐ سے تعارف کرایا اور کہا "یہ ہمارے شیخ اور جنگی سردار ہیں۔ مُثنّٰی نے عرض کیا "اے قریشی بھائی، میں نے آپ کی بات سُنی اور اُسے پسند کیا۔ مگر میرا جواب بھی وہی ہے جو ہانی نے دیا ہے۔ ایک ہی مجلس میں ہمارا اپنے دین کو چھوڑ کر آپ کی پیروی اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہم ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں ہمیں دو رُکاوٹوں سے سابقہ درپیش ہے، ایک یمامہ ہے اور دوسری سَماوہ[1]"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ دونوں رکاوٹیں کیسی ہیں"۔ مُثنّٰی نے کہا "ایک تو پہاڑ اور زمین عرب ہے۔ اور دوسرا ایران کا علاقہ

---

[1] عراق کا وہ حصہ جو جزیرۃ العرب سے متصل ہے۔

اور کسریٰ کی نہریں۔ کسریٰ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ نہ ہم خود معمول کے خلاف کوئی نیا کام کریں گے اور نہ کسی ایسے کام کرنے والے کو اپنے ہاں جگہ دیں گے۔ آپ جس چیز کی طرف ہمیں بُلا رہے ہیں، شاید وہ بادشاہوں کو گوارا نہ ہو۔ جہاں تک بلادِ عرب کا تعلق ہے، اس میں تو ہمارا قصور مغفور اور عُذر مقبول ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ عرب کے مقابلے میں ہم آپ کی حمایت کریں تو یہ ہم کر سکتے ہیں مگر فارس کے مقابلے میں یہ ہمارے بس کی بات نہیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم نے بُرا نہیں کیا اگر سچی بات کہہ دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے دین کو لے کر جو شخص اٹھتا ہے وہ کوئی استثناء نہیں کرتا بلکہ ہر جہت سے اُس کی حمایت کرتا ہے"۔ پھر ارشاد ہوا "تم لوگ ذرا صبر کرو تو اللہ فارس والوں کا ملک و مال تمہیں عطا کر دے گا اور ان کی بیٹیوں کو تمہارے تصرف میں دے دے گا۔ کیا تم اللہ کی تسبیح و تقدیس کرو گے؟"۔ نعمان بن شریک نے کہا "اے قریشی بھائی، یہ بات آپ کی ہم نے مانی"۔ اس کے بعد حضورؐ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا پڑھتے ہوئے اُٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر روانہ ہو گئے۔

بنی عَبْس سے ملاقات واقدی نے عبداللہ بن وابصۃ العَبْسی سے اُن کے دادا کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہمارا قبیلہ بنی عَبْس مسجدِ خَیف کے پاس جَمْرَةُ الاُولٰی کے قریب ٹھیرا ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری قیام گاہوں کی طرف تشریف لائے۔ زیدؓ بن حارثہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ہمیں اپنی بات کی طرف دعوت دی اور ہم نے اسے قبول نہ کیا۔ اس سے پہلے بھی ہر حج کے زمانے میں آپ ہماری قیام گاہوں پر آتے رہے تھے اور ہم نے کبھی آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا تھا۔ اس مرتبہ جب آپ تشریف لائے تو مَیْسَرہ بن مَسْروق العَبْسی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کہا "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اِن کی تصدیق کریں اور انہیں اپنے ساتھ لے جا کر اپنے علاقے کی مرکزی جگہ میں رکھیں تو یہ مناسب رائے ہوگی، کیونکہ قسم بخدا ان کا کام غالب ہو کر رہے گا اور پوری طرح کامیاب ہوگا"۔ مگر قوم کے لوگوں نے کہا "چھوڑو بھی، ہمیں اُس کام میں نہ ڈالو جس کا بوجھ سہارنا ہمارے بس میں نہیں ہے"۔ حضورؐ کو مَیْسَرہ کے بارے میں کچھ اُمید ہوئی اور آپ نے اس سے بات کی۔ اس نے کہا "آپ کا کلام کتنا اچھا اور روشن ہے، مگر میری قوم میری مخالفت کر رہی ہے۔ اگر وہی ساتھ نہ دے تو دوسرے لوگ تو پھر بھی بعید تر ہوں گے"۔ ایک مدتِ دراز کے بعد حجۃ الوَداع کے موقع پر مَیْسَرہ آپ

سے ملے تو آپؐ نے انہیں پہچان لیا۔ انہوں نے عرض کیا،" یارسول اللہ، جب پہلی مرتبہ آپ ہمارے پڑاؤ پر آئے مجھے اس وقت سے میں برابر آپ کی پیروی کا حریص رہا ہوں۔ مگر جو کچھ ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب میں اتنی تاخیر کے بعد مسلمان ہو رہا ہوں"۔

اِس طرح تمام قبائل عرب اُس نعمت سے محروم رہ گئے جو اپنے پاؤں چل کر اُن کے پاس آئی تھی، اور اہل مدینہ وہ خوش نصیب لوگ تھے جو خود اپنے پاؤں چل کر اُس کے پاس گئے اور اُسے پالیا۔ ہم ذرا پیچھے پلٹ کر یہ بتائیں گے کہ اس مبارک بستی کے لوگ کن وجوہ سے پہلے ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

اَوس و خزرج کی ابتدائی تاریخ ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء عیسوی میں سدِ مارب کے پھٹنے سے جو سیلابِ عظیم یمن میں برپا ہوا تھا اس کی وجہ سے قومِ سبا کا ایک شخص عَمرو بن عامر اپنے بال بچوں کو لے کر شمال کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ اس کے ایک بیٹے جُفنَہ کی اولاد شام کے علاقے میں آباد ہوئی اور غسان کے نام سے اس نے شہرت پائی۔ دوسرے بیٹے حارثہ نے حجاز کے پہاڑوں اور بحرِ احمر کے ساحل کے درمیان اُس طویل میدانی علاقہ میں سکونت اختیار کی جو تہامہ کہلاتا ہے۔ اس کی اولاد خُزاعَہ کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرے بیٹے ثَعلَبَہ کی اولاد میں ایک شخص حارثہ تھا جس کے دو بیٹے ایک ہی بیوی قَیلُہ کے بطن سے تھے، ایک کا نام اَوس تھا اور دوسرے کا خزرج۔ ان کی اولاد یثرب (مدینہ) میں جاکر آباد ہوئی جہاں پہلے سے یہودی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ایک مدت تک یہودیوں نے اَوس اور خزرج کی اولاد کو اصل شہر اور اس کی سرسبز و شاداب زمینوں میں نہ گھسنے دیا اور یہ لوگ اطراف کی بنجر زمینوں میں تنگی ترشی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے اپنے ہم نسب غسانیوں سے مدد مانگی۔ وہ فوج لے کر آئے اور یہودیوں کو زبردستی شہر سے نکال کر اَوس و خزرج کو اُس پر قبضہ دلوایا۔ یہودیوں کے دو قبیلے، بنی قُرَیظَہ اور بنی نَضِیر اطرافِ شہر میں بسنے پر مجبور ہوئے، اور ایک قبیلے بنی قَینُقاع نے قبیلہ خزرج کی پناہ لے کر شہر کے ایک محلے میں سکونت اختیار کی۔ بنی قُرَیظَہ اور بنی نَضِیر نے جب دیکھا کہ ان کا حریف قبیلہ بنی قَینُقاع، خزرج کا حلیف بن گیا ہے، تو انہوں نے قبیلہ اَوس سے معاہدہ کر کے اُس کو اپنا حلیف بنا لیا۔ اِس کے بعد اَوس و خزرج پونے دو سو برس تک یہودیوں کے ساتھ ایک ہی شہر اور اس کے نواح میں آباد رہے۔ اِس دوران میں یہ دونوں عرب قبیلے ہم نسب ہونے

کے باوجود، اور آپس میں شادی بیاہ کے رشتے ہونے کے باوجود، جاہلیت کی بنا پر خود بھی باہم لڑتے رہے اور یہودی قبیلے اپنے اپنے حلیف قبیلوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے بھی رہے، کیونکہ ان کی آپس کی جنگ ہی میں وہ اپنی خیر دیکھتے تھے، اور ان کے اتحاد کو اپنے لیے موت کا پیغام سمجھتے تھے۔ اس طرح پونے دو صدیوں میں ان کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائیوں کے علاوہ گیارہ[11] خونریز معرکے برپا ہوئے جن میں آخری معرکہ یومِ بُعاث ہجرت سے صرف پانچ سال پہلے (۸ بعدِ بعثت مطابق ۶۱۸ء) میں پیش آیا تھا اور دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اس میں مارے گئے تھے[1]۔ لیکن اِن لڑائیوں بھڑائیوں کے باوجود اہلِ مدینہ پر یہودیوں کا مذہبی اثر اتنا زیادہ تھا کہ جس عورت کے بچے پیدا ہو کر مرجاتے وہ مَنّت مانتی تھی کہ اب جو بچہ پیدا ہوگا اُسے یہودی بناؤں گی۔ اِس صورتِ حال کا ذکر ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے کیا ہے۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ابی حاتم، اور ابن حبان نے بھی اس کے متعلق متعدد روایات نقل کی ہیں جو ابن عباسؓ، مجاہد، سعید بن جُبیر، شَعبی اور حسن البصری وغیرہم سے مروی ہیں۔

اِس تاریخی پسِ منظر کے اثرات یہ مختصر تاریخی حالات جو بیان کیے گئے ہیں، اُن کی وجہ سے اَوس و خزرج پر تین اہم اثرات مُترتّب ہوئے تھے جنہوں نے دوسرے تمام عرب قبائل کے برعکس اُن کو قبولِ اسلام کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی مستعد کر رکھا تھا، اور اس کا موقع سامنے آتے ہی اِنہی اسباب کی وجہ سے یہ لوگ اِس دین اور اس کے داعی سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اِس طرح لپکے جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔

---

[1] ابن سعد کے بیان کے مطابق جنگ بُعاث ہجرت سے ۶ سال پہلے ہوئی تھی۔ بُعاث ایک مقام، یا گڑھی یا مزرعے کا نام تھا جو بنی قُریظہ کے قریب مدینے سے دو میل پر واقع تھا۔ جنگ میں ایک طرف قبیلہ اَوس تھا جس کا سردار حضرت اُسیدؓ بن حُضَیر کا باپ حُضَیر تھا، اور بنی قُرَیظہ و بنی نَضِیر اس کے ساتھ شریکِ جنگ تھے۔ دوسری طرف قبیلہ خزرج تھا جس کا رئیس عَمرو بن نعمان بَیاضی تھا اور یہودِ بنی قَینُقاع اس کے ساتھ تھے۔ اَوس کو لڑائی میں فتح حاصل ہوئی، مگر دونوں فریقوں کو اتنا نقصان پہنچا کہ ان کے سوچنے سمجھنے والے لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر ہم اِسی طرح ایک دوسرے کے دشمن رہے تو لڑتے لڑتے ختم ہو جائیں گے۔

ان میں سے پہلا اثر یہ تھا کہ ایک مدت دراز سے یہودیوں کے ساتھ میل جول اور ربط و ضبط رکھنے کے باعث اُن کے کان نبوت، وحی، کتاب، شریعت وغیرہ الفاظ اور ان کے معانی سے آشنا ہو چکے تھے، اس وجہ سے اُن کے لیے یہ چیزیں اتنی غیر مانوس نہ تھیں جتنی دوسرے اہلِ عرب کے لیے تھیں۔

دوسرا اثر یہ تھا جیسا کہ ابن ہشام اور طبری نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ اپنے ہمسایہ یہودیوں کی باتوں سے اُن کو اکثر یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ یہ لوگ بڑی بے چینی کے ساتھ ایک نبی کی آمد کے منتظر ہیں جس کے آنے کی پیشین گوئیاں ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو غیر یہودی قوموں کا غلبہ مٹے اور ہمارے عروج کا دَور شروع ہو۔ خصوصیت کے ساتھ جب کبھی اَوس و خزرج کے ساتھ ان کی خصومت ہوتی تو وہ کہتے تھے کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے، وہ جب آئے گا تو ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تم کو ایسا ماریں گے جیسے عاد و اِرم مارے گئے تھے۔ قرآن مجید میں بھی اُن کی اِن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ (البقرہ-۸۹)

اور اس سے پہلے وہ خود کافروں کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دُعائیں مانگا کرتے تھے۔

یہودیوں کی ان باتوں سے اَوس و خزرج کے لوگوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر وہ نبی آئے تو سب سے پہلے آگے بڑھ کر وہی اس کی پیروی اختیار کرلیں تاکہ یہودی ان پر سبقت نہ لے جانے پائیں۔

تیسرا اثر یہ تھا کہ اپنی تباہ کُن خانہ جنگی سے وہ بہت تنگ آئے ہوئے تھے اور کسی ایسی قیادت کے طلب گار تھے جو ان میں وحدت و اُخوت پیدا کر دے۔ قرآن مجید میں اُن کی اِس حالت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۔
(آل عمران-۱۰۳)

اور تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے اس سے تمہیں بچایا۔

اپنی اسی مصیبت کا علاج کرنے کے لیے اہلِ مدینہ یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ خزرج کے رئیس عبداللہ بن اُبی کو اپنا بادشاہ بنالیں تاکہ ان کا باہمی کا تفرقہ مٹے اور ایک شخص کی ریاست پر وہ سب جمع ہو جائیں۔ ان حالات میں آخر کار وہ نعمت اُن کے سامنے آگئی جس کے درحقیقت وہ طلبگار تھے (ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۲۳۴)۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ اہلِ مدینہ کس طرح رفتہ رفتہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس ہوئے۔

مدینے کے اوّلین شخص کی حضورؐ سے ملاقات ابن ہشام اور طبری نے ابن اسحاق سے عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری کی یہ روایت نقل کی ہے کہ مدینے کے سب سے پہلے شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے وہ سُوَید بن صامت تھے۔ وہ لیاقت، بہادری، شعر و سخن اور شرف و نسب کی بنا پر اپنی قوم میں کامل کہلاتے تھے۔ (ابن سعد نے تشریح کی ہے کہ جو شخص اپنی قوم میں با عزت اور صاحبِ عقل و رائے ہوتا، لکھنا پڑھنا بھی جانتا، تیر اندازی اور تیراکی میں بھی ماہر ہوتا، اُس کو جاہلیت کے زمانے میں "کامل" کہا جاتا تھا۔ طبقات، جلد سوم، صفحہ ۶۰۳)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی رشتہ داری بھی تھی۔ اُن کی ماں لیلیٰ بنت عمرو حضورؐ کے دادا کی والدہ سلمیٰ بنتِ عمرو کی سگی بہن تھیں۔ وہ حج یا عمرے کے لیے مکّے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قاعدے کے مطابق ان سے ملے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ انھوں نے کہا شاید آپ کے پاس بھی وہی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ حضورؐ نے پوچھا آپ کے پاس کیا چیز ہے۔ انھوں نے کہا مَجلّۂ لقمان، یعنی حکمتِ لقمان۔ حضورؐ نے فرمایا وہ مجھے سنائیے۔ انھوں نے اُسے پڑھ کر سنایا۔ آپ نے فرمایا "یہ اچھا کلام ہے، مگر میرے پاس جو چیز ہے وہ اِس سے افضل ہے، وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے، وہ ہدایت اور نور ہے"۔ پھر حضورؐ نے ان کو قرآن سنایا اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ انھوں نے اس سے بُعد نہ کیا اور کہا کہ فی الواقع یہ اچھا کلام ہے۔ اس کے بعد وہ مدینے واپس گئے اور کچھ مدت بعد خزرج نے انھیں قتل کر دیا۔ یہ جنگ بُعاث سے پہلے کا واقعہ ہے[1]۔ اُن کی قوم کا خیال تھا

[1] بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ سُوید کے قتل ہی پر جنگ بُعاث برپا ہوئی تھی۔

کہ وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ بیہقی نے بھی اس قصے کو محمد بن اسحاق سے مختصراً نقل کیا ہے۔

مدینے کے ایک دوسرے وفد سے ملاقات ابن ہشام اور طبری نے محمد بن اسحاق کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جنگ بُعاث سے پہلے، جبکہ اوس و خزرج کے درمیان عداوت کی آگ بھڑک اٹھنے کے لیے تیار تھی، اوس کی ایک شاخ بنی عبدالاشہل کا ایک وفد ابوالحَیسر (یا ابوالحَیسَر) انس بن رافع کی قیادت میں مکے آیا تاکہ خزرج کے مقابلے میں قریش کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی آمد کا علم ہوا تو آپ ان سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا "کیا تم اُس چیز سے بہتر چیز قبول کرنا پسند کرو گے جس کے لیے تم آئے ہو؟" انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا" میں اللہ کی طرف سے اُس کے بندوں کی طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔ ان کو یہ دعوت دینے آیا ہوں کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ میرے اُوپر ایک کتاب نازل کی گئی ہے۔" پھر آپ نے اُن کو اسلام کی تعلیمات بتائیں اور قرآن سُنایا۔ وفد میں ایک نوجوان ایاس بن مُعاذ بھی تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی باتیں سُن کر کہا" لوگو، واللہ یہ چیز اُس سے بہتر ہے جس کے لیے تم آئے ہو۔" مگر ابوالحَیسر نے بَطحا کی مٹی اُٹھا کر اُن کے مُنہ پر ماری اور کہا "ہمیں اِن باتوں سے معاف کرو، ہم کسی اور کام کے لیے آئے ہیں"۔ ایاس چپ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ اِن لوگوں کے مدینہ واپس جانے کے بعد جنگ بُعاث پیش آگئی۔ اور اس پر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ایاس کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی موت کے وقت جو لوگ موجود تھے اُن کا بیان ہے کہ آخر وقت تک وہ ان کی زبان سے اللہ کی تہلیل و تکبیر اور حمد و تسبیح سُنتے رہے۔ اس لیے ان کو اس امر میں کوئی شک نہ تھا کہ ایاس اُس مجلس سے اسلام قبول کر کے آئے تھے اور انہوں نے اسلام ہی پر جان دی۔

ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے اس واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اُن میں چند باتیں ابن اسحاق کے بیان سے زائد ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی عبدالاشہل کا یہ وفد مکہ میں عُتبہ بن ربیعہ کے پاس ٹھیرا تھا جس نے اِن لوگوں کا بڑا اکرام و اعزاز کیا۔ مگر جب انہوں نے اس سے حلیفانہ معاہدے کی بات کی تو اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہمارا علاقہ آپ کے علاقے سے بہت دُور ہے۔ آپ کی طرف سے مدد کی درخواست آئے تو ہمارے پہنچتے پہنچتے دشمن اپنا کام کر جائے گا، اور یہی حال ہمارے

معلوم ہی ہوگا۔ واقدی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب ایاس بن معاذ نے اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیا تو ابوالحیسر نے ان پر مٹی پھینکتے ہوئے کہا کہ ہم آئے تھے قریش کو اپنے دشمنوں کے خلاف حلیف بنانے کے لیے اور تم چاہتے ہو کہ ہم قریش کو بھی دشمن بنا کر واپس چلے جائیں۔ واقدی کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ جن لوگوں نے مرتے وقت ایاس کو تسبیح و تہلیل کرتے سنا تھا وہ محمدؒ بن مَسْلَمہ، سَلَمہ بن سَلَامہ بن وَقْش اور ابوالہَیْثَم بن التَّیِّہان تھے۔

انصار کے اولین گروہ کا قبول اسلام اور پہلی بیعت عَقَبہ

سلسلہ بعد بعثت (۶۲۰ء) کے زمانہ حج میں حضورؐ اپنے قاعدے کے مطابق قبائل عرب سے ملاقات کے لیے منیٰ کی طرف نکلے اور پھرتے پھراتے عَقَبہ[1] کے قریب قبیلۂ خزرج کے ایک گروہ کے پاس پہنچے۔ ابن ہشام اور طبری نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا "کون لوگ ہیں"؟ انہوں نے کہا "خزرج کے چند افراد ہیں"۔ فرمایا "کیا آپ لوگ بیٹھیں گے کہ میں آپ سے کچھ باتیں کروں"؟ انہوں نے کہا ضرور۔ چنانچہ وہ حضورؐ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے انہیں اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام ان کے سامنے پیش کیا اور انہیں قرآن سنایا۔ ان لوگوں نے آپس میں کہا "بھائیو، جان لو کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد کے ڈراوے یہودی تمہیں دیا کرتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر سبقت لے جائیں"۔ چنانچہ پورے اطمینان کے ساتھ انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی، آپ کی تصدیق کی اور اسلام جو آپ نے ان کے سامنے پیش فرمایا تھا اُس پر ایمان لے آئے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ "ہم نے اپنی قوم کو اِس حالت میں چھوڑا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس میں اُس سے زیادہ باہمی عداوت پائی جاتی ہو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے اُن کو جمع کر دے۔ ہم اُن کے پاس واپس جاتے ہیں اور آپ کی طرف اُنہیں دعوت دیتے ہیں اور وہ دین اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں جو ہم نے قبول کیا ہے۔ اگر اللہ نے ان کو آپ پر جمع کر دیا تو کوئی شخص آپ سے زیادہ طاقت ور نہ ہوگا"۔ بعض روایات میں اِس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ بیعت کے بعد حضورؐ نے ان لوگوں سے فرمایا "کیا تم میری پشت پناہی کرو گے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں"؟ انہوں نے عرض کیا "یارسولؐ اللہ ابھی ہمارے

---

[1] عَقَبہ گھاٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں جس گھاٹی کا ذکر ہے وہ منیٰ کے علاقے میں مکّہ کے راستے پر واقع ہے۔

ہاں جنگ بُعاث ہو چکی ہے۔ اس حالت میں اگر آپ تشریف لے گئے تو آپ پر لوگوں کا جمع ہونا مشکل ہوگا، فی الحال آپ ہمیں اپنے لوگوں کی طرف واپس جانے دیجیے۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ ہمارے باہمی تعلقات درست فرما دے اور ہم لوگوں کو اُس چیز کی طرف دعوت دیں جس کی طرف آپ نے ہمیں دعوت دی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپ پر جمع کر دے۔ پھر آپ سے زیادہ طاقت ور کوئی نہ ہوگا۔ اب ہم آئندہ سال آپ سے حج میں ملیں گے"۔

ابن اسحاق، شعبی اور زُہری رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ چھ آدمی تھے۔ اور ابن سعد نے واقدی کا قول بھی یہی نقل کیا ہے کہ ان کی تعداد چھ تھی۔ اُن کی فہرست یہ ہے۔

بنی مالک بن النّجّار میں سے: (۱) ابو اُمامہؓ اسعد بن زُرارہ (جاہلیت میں بھی توحید کے قائل اور بت پرستی کے مخالف تھے)۔

(۲) عوفؓ بن الحارث بن رفاعہ (ان کی ماں کا نام عفراء تھا)۔

بنی زُرَیق میں سے: (۳) رافعؓ بن مالک (جاہلیت کے زمانے میں یہ "کامل" کہلاتے تھے)۔

بنی سَلِمہ میں سے: (۴) قُطبہؓ بن عامر بن حَدِیدہ۔

بنی حَرام بن کعب میں سے: (۵) عُقبہؓ بن عامر بن نابی۔

بنی عُبَید بن عَدِی میں سے: (۶) جابرؓ بن عبداللہ بن رِئاب۔

ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ سیرت کا علم رکھنے والے بعض لوگوں نے جابرؓ بن رئاب کی جگہ حضرت عبادہ بن صامت کا نام لکھا ہے۔ موسیٰ بن عُقبہ نے اس پہلی بیعتِ عقبہ کے شرکاء کی تعداد آٹھ بیان کی ہے جن میں اسعد بن زُرارہ اور رافع بن مالک کے ساتھ انہوں نے مُعاذؓ بن عفراء، یزیدؓ بن ثعلبہ، ابو الہیثمؓ بن التَّیِّہان، اور عُوَیم بن ساعِدہ کے نام شامل کیے ہیں، پھر ایک کمزور بیان کی حیثیت سے لکھا ہے "کہا جاتا ہے کہ ان میں عُبادہؓ بن صامت اور ذَکوانؓ بن عبدِ قیس بھی تھے"۔ لیکن اہل علم کی اکثریت نے محمد بن اسحاق کے بیان کو قبول کیا ہے، اور فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے اِسی کو دوسرے بیانات پر مقدم رکھا ہے۔

ابن سعد نے واقدی کے اُس قول کے علاوہ، جس کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں، اہل مدینہ کے قبولِ اسلام

کے بارے میں تین قول اور نقل کیے ہیں۔ (۱) سب سے پہلے اسعدؓ بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس جاہلیت کی رسم کے مطابق قومی مفاخرت کا مقابلہ کرنے کے لیے عُتبہ بن ربیعہ کے پاس مکے گئے تھے، مگر قبل اس کے کہ عُتبہ سے ملتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سن کر آپ سے ملے اور مسلمان ہو گئے۔ پھر حضرت اسعدؓ نے مدینے جا کر ابوالہیثمؓ بن التیہان سے اسلام کا ذکر کیا اور انہوں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ ان چھ آدمیوں میں شامل ہوئے جو عقبہ کے مقام پر حضورؐ سے ملے تھے۔ (۲) سب سے پہلے رافع بن مالک الزُّرَقی اور مُعاذ بن عفراء عُمرے کے لیے مکے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے حضورؐ کا ذکر سنا اور آپ سے ملاقات کر کے اسلام قبول کر لیا۔ (۳) منیٰ میں حضورؐ سے مدینے کے چھ آدمیوں کی نہیں بلکہ آٹھ آدمیوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ آٹھ آدمی وہی ہیں جن کے نام ہم نے موسیٰ بن عُقبہ کے حوالہ سے اُوپر درج کیے ہیں۔

مدینے سے دوسرے وفد کی حاضری اور دوسری بیعت عقبہ

ابن سعد اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عقبہ کے مقام پر اسلام قبول کرنے والے یہ اوّلین اصحاب جب مدینے واپس پہنچے تو انہوں نے وہاں اسلام کا چرچا شروع کیا یہاں تک کہ انصار کے محلّوں میں سے کوئی محلّہ ایسا باقی نہ رہا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہ ہونے لگا ہو۔ پھر دوسرے سال (یعنی ۱۲ھ بعد بعثت میں) حج کے موقع پر مدینے کے بارہ آدمی حضورؐ سے اُسی عقبہ کے مقام پر ملے جہاں گذشتہ سال خزرج کے لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں پانچ آدمی تو وہی تھے جو پچھلے سال مسلمان ہوئے تھے (جابر بن عبداللہؓ بن رِئاب اِس سال نہیں آئے تھے)۔ باقی سات آدمیوں میں سے ۵ خزرج کے اور ۲ اَوس کے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

خزرج کے بنی النجار میں سے : (۱) مُعاذ بن الحارث بن رِفاعہ (عَفراءؓ کے صاحبزادے)۔

" کے بنی زُریق میں سے : (۲) ذکوانؓ بن عبد قیس (ابن سعد اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ یہ مدینے سے مکہ واپس آ کر حضورؐ کے ساتھ ہی رہے اور آپ کے ساتھ ہجرت کی)۔

" بنی عوف بن الخزرج میں سے : (۳) عُبادہؓ بن صامت۔

(۴) یزیدؓ بن ثعلبہ۔

بنی سالم بن عَوف بن خزرج میں سے : (۵) عباسؓ بن عُبادہ بن نَضلہ (ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ بھی حضورؐ کے ساتھ مکہ میں آکر رہے اور آپؐ کے ساتھ ہی ہجرت کی)۔

اَوس کے بنی عبدالاشہل میں سے : (۶) ابوالہیثمؓ بن التّیہان (یہ زمانہ جاہلیت میں بھی توحید کے قائل اور بُت پرستی کے مخالف تھے)۔

" بنی عَمرو بن عَوف میں سے : (۷) عُوَیمؓ بن ساعِدہ۔

اِن لوگوں سے حضورؐ نے جو بیعت لی وہ بیعتِ نساء کے نام سے مشہور ہے کیونکہ وہ اُس بیعت کے الفاظ سے بہت مشابہ ہے جو اِس واقعہ کے کئی سال بعد قرآن مجید، سورۂ ممتحنہ، آیت ۱۲ میں مسلمان عورتوں سے بیعت لینے کے لیے تجویز کیے گئے۔ ابن اسحاق نے حضرت عُبادہ بن صامت کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی:

اَنْ لَّا نُشْرِكَ باللہ شیئًا، ولا نَسْرِقَ، ولا نَزْنِی، ولا نقتلَ اولادَنا، ولا نأتی ببھتانٍ نفتریہ بین ایدینا وارجلنا، ولا نعصیہ فی معروفٍ ونطیعہ السمع والطاعۃ فی العُسرِ والیُسرِ والمنشط والمکرہ واَثَرۃٍ علینا وَاَن لا ننازعَ الامرَ اھلہٗ (زاد احمد فی المسند: وان رأیت ان لك فی الامر حقًا - وزاد البخاری، اِلّا ان تروا کفرًا بواحًا) واَن نقول بالحق حیث کنّا، لا نخافُ لومۃَ لائمٍ۔ ثم قال صلی اللہ علیہ وسلم: فان وفیتم فلکم الجنۃ ومن غشی من ذٰلك شیئًا کان امرہٗ الی اللہ ان شاء عذّبہ وان شاء عفا عنہ (وفی روایۃٍ، وان غشیتم من ذٰلك شیئًا فاُخذتم بحدّہٖ فی الدنیا فھو کفارۃ لہ، وان سُترتم علیہ الی یوم القیٰمۃ فامرکم الی اللہ عز وجل - ان شاء عذب وان شاء غفر")۔

" یہ کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گے (یعنی کسی پر

جھوٹا الزام نہ لگائیں گے)، اور یہ کہ کسی امرِ معروف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کریں گے، اور آپ کا حکم سُنیں گے اور مانیں گے خواہ ہم خوش حال ہوں یا تنگ حال اور خواہ وہ حکم ہمیں گوارا ہو یا ناگوار اور خواہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے، اور ہم حکومت کے معاملہ میں اہلِ حکومت سے نزاع نہ کریں گے (مُسندِ احمد میں اضافہ ہے کہ "اگرچہ تم سمجھتے ہو کہ حکومت میں ہمارا حق ہے" اور بخاری میں یہ اضافہ ہے کہ "اِلّا یہ کہ تم کھلا کھلا کفر دیکھو")، اور یہ کہ ہم جہاں اور جس حال میں بھی ہوں حق بات کہیں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ پس اگر تم نے اس عہد کو وفا کیا تو تمہارے لیے جنت ہے، اور اگر کسی نے ممنوع کاموں میں سے کسی کا ارتکاب کیا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، چاہے عذاب دے، چاہے معاف فرما دے (ایک روایت میں ہے کہ "اگر تم نے ان ممنوع کاموں میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور پکڑے گئے اور دُنیا میں تم کو سزا دے دی گئی تو وہ اس کا کفارہ ہوگی، اور اگر قیامت تک تمہارے فعل پر پردہ پڑا رہ گیا تو تمہارا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ چاہے سزا دے چاہے معاف کر دے")۔

اس حدیث کے مختلف اجزا بخاری، کتاب الایمان، ابواب مناقب الانصار، کتاب الحدود، کتاب الفتن، کتاب الاحکام، اور مسلم، کتاب الحدود اور کتاب الامارۃ، اور مسند احمد مرویات عُبادہ بن صامت میں پائے جاتے ہیں۔ (باقی)

حقوقِ نسواں کمیٹی رپورٹ پر

تبصرہ

(۵)

از جناب ملک غلام علی صاحب

ترجمان کے اشارات میں "حقوقِ نسواں کمیٹی رپورٹ" پر جس تبصرے کا آغاز کیا گیا تھا، اس کی چوتھی قسط ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ (نومبر ۱۹۷۶ء) کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے جس میں رپورٹ کی دفعہ ۹۲ تک بحث کی جا چکی ہے۔ اسی ذی قعدہ کے پرچے میں راقم کا وہ مضمون بھی چھپا ہے جو صدر حقوقِ نسواں کمیٹی کی بعض اُن توضیحات کے جواب میں لکھا گیا تھا جو انہوں نے اکتوبر کے اواخر میں پریس میں طبع کرائی تھیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تبصرہ نگار کو حج بیت اللہ اور حرم نبوی کی زیارت کی سعادت عطا فرمائی اور قریب دو ماہ کے بعد اس مبارک سفر سے واپسی ہوئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم جیسے عاجز و بے نوا پر ایسا فضل و کرم فرمایا۔ اُسی سے دُعا ہے کہ وہ اسے حجِ مبرور اور سابقہ گناہوں کا کفارہ بنائے، آمین۔ اس دوران میں بحمداللہ جناب عبدالحمید صدیقی صاحب کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی ہے کہ وہ ترجمان کے اشارات لکھنے کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ تاہم رپورٹ پر ہماری تنقید چونکہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے، اس لیے اس کا باقی حصہ مضمون کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا حقوقِ نسواں کمیٹی کی رپورٹ کا دفعہ ۹۲ تک جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب ہم دفعات مابعد کو لیتے ہیں۔ دفعہ ۹۳ سے لے کر دفعہ ۱۰۸ تک جو سفارشات مرتب کی گئی ہیں ان سے مقصود و مطلوب یہ ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لا کر کھڑا کر دیا جائے اور انہیں "معاشی آزادی اور تمدنی استقلال" سے پوری طرح بہرہ اندوز کیا جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ

کے ابتدائیہ ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کے اُمورِ مفوّضہ یہ ہیں کہ:

"پاکستانی خواتین کی معاشرتی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے قانونی اصلاحات پیش کی جائیں کیونکہ موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین، جو کام کرنے کی خواہشمند ہیں، اُن کے لیے بھی حکومت کی ملازمتوں، سرکاری اور دیگر دفاتر میں پائے جانے والے ماحول اور حالاتِ کار کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے"۔

کمیٹی اور اس کے حدودِ کار متعین کرنے والے اربابِ اختیار نے جن اعلیٰ مقاصد و خواہشات کا اظہار فرمایا ہے اُن کا مطلب جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ مختلف تدابیر اختیار کرنے کے باوجود ابھی تک پاکستان کے مسلمان معاشرے پر تاریک خیالی اور رد قیانوسیت طاری ہے۔ مرد اور عورت دونوں کی راہ میں ایسی ذہنی اور خارجی رکاوٹیں اب تک موجود ہیں جن کے باعث عورت شمعِ انجمن بننے کے بجائے بس چراغِ خانہ بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارے ان مخلوط تعلیمی نظام رائج ہے۔ بہت سی درسگاہیں ایسی ہیں جہاں طلبہ و طالبات کو یکجا پڑھایا جاتا ہے۔ پڑھانے والے مرد بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں معلّمات و طالبات میں ایسی بھی ہیں جو نہ چہرہ ڈھانکتی ہیں، نہ بال چھپاتی ہیں، نہ لباس و جسم کی دوسری زینت کو مخفی رکھتی ہیں۔ اُستاد، شاگرد، اور ہم مکتب نگاہیں نیچی رکھنے کے بجائے ایک دوسرے سے بے حجابانہ بول چال اور میل جول رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود جب لڑکیاں تعلیم سے فارغ ہوتی ہیں تو وہ دفاتر یا صنعتی و کاروباری اداروں میں ملازمت کرنے، سیاسی سرگرمیوں، اور جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے کے بجائے بس گھروں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ باہر نکلنے اور مردوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی ہمت نہ وہ خود کرتی ہیں، نہ مرد ہی اُن کی اس معاملے میں ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کمیٹی کے ارکان اس صورتِ حال سے ناخوش ہیں اور اسے بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال کی تبدیلی کن مراحل سے گزرے گی اور کس انتہا تک پہنچے گی یہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔

ہر شخص جو دُنیا کے حالات اور تہذیبِ حاضر کے اساسی نظریات سے واقف ہے وہ یہ جانتا ہے کہ مغرب کی مادہ پرستانہ اور عیاشانہ تہذیب اور اباحیت پسند تمدن کی بنیاد ایک فکری و نظری تثلیث پر رکھی گئی ہے۔ اس تثلیث کے اقانیمِ ثلاثہ یہ ہیں:- عورت اور مرد کے مابین نام نہاد مساوات، عورت کی معاشی اُٹھان اور اس کا اقتصادی استقلال اور عورت و مرد کا آزادانہ اختلاط۔ ان تینوں عناصر کا

چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان میں سے ہر ایک عنصر دوسرے کو سہارا دیتا ہے اور اس سے سہارا لیتا ہے۔ مغربی معاشرے نے ان تینوں اصولوں کو خوب اچھی طرح برت کر اور پرکھ کر دیکھ لیا ہے۔ نتیجہ جو کچھ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی عفت اور اس کے ساتھ مرد کی پاکدامنی تار تار ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر جو غیر فطری جنسی تونس دونوں کو لگ چکی ہے وہ کسی طرح بجھنے اور ختم ہونے میں نہیں آتی۔ فواحش کا ارتکاب اب کھلم کھلا ہو رہا ہے اور نت نئی شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ امراضِ خبیثہ نے ایک وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ازدواجی زندگی میں وفاداری برائے نام بھی باقی رہتی نظر نہیں آتی۔ اولادِ حلال کی پیدائش کم اور اولادِ حرام کی پیدائش زیادہ ہو رہی ہے۔ خاندانی نظم و ضبط کے فقدان کی بدولت کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے جرائم روز افزوں ہیں۔ پھر جس معاشی آزادی کے حصول کے لیے عورت گھر سے نکلی تھی یا اُسے نکالا گیا تھا، وہ آزادی اب مَعاشی مسابقت سے بڑھ کر مَعاشی غلامی کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ گھر کا عائلی نظام اور گھر سے باہر کا معاشرتی و اجتماعی نظام، جو تقسیمِ کار اور فرقِ مراتب کا طلبگار ہے، وہ بالکل ابتر اور تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں مغرب کے مقلدین اہلِ مغرب کی کورانہ نقالی پر تُلے ہوئے ہیں اور اس کا نام انہوں نے آزادیٔ نسواں رکھ چھوڑا ہے کیونکہ اُن کے فرنگی پیشواؤں نے اس کا یہی عنوان تجویز کر دیا ہے۔

ہم اس بات کو پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اسلام نے عورت کے اپنے نان و نفقہ یا اس کے اہل و عیال کے اخراجات کا بوجھ کسی صورت میں بھی عورت پر نہیں ڈالا بلکہ اُسے مرد یا بدرجۂ آخر بیت المال پر ڈالا ہے۔ عورت کا گھر کے اندر رہتے ہوئے امورِ خانہ داری سرانجام دینا، گھریلو معاملات میں افرادِ خانہ کی اعانت کرنا، ازدواجی زندگی میں حمل و ولادت اور بچوں کی رضاعت و تربیت کی نازک ذمہ داریاں نباہنا — یہ عورت کا اوّلین فریضہ ہے جو کہ ہمہ وقتی مشغلہ (WHOLE TIME JOB) ہے۔ یہ اپنی اہمیت و افادیت اور قدر و منزلت کے اعتبار سے مرد کے فرائضِ حیات سے کسی صورت میں کمتر و فروتر نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دائرۂ کار کی یہ تفریق و تقسیم صرف شہری زندگی میں ممکن ہے۔ دیہات کی عورتیں ہمیشہ گھروں سے باہر نکل کر کھیت، کنوئیں اور تالاب پر جاتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے۔ دیہات میں مرد اور عورت دونوں کی زندگی بالعموم اپنے ہی گاؤں تک محدود رہتی ہے۔ عورت اگر گھر سے باہر نکلتی بھی ہے تو وہ محرم مردوں یا

جان پہچان کی عورتوں کے ساتھ رہتی اور کام کاج کرتی ہے۔ پھر وہاں کی زندگی ایسی کٹھن اور پُر مشقت ہے کہ عورتوں کے لیے بن ٹھن کر نکلنا اور زیب و زینت کے ساتھ گھومنے پھرنا کم ہی ممکن ہوتا ہے۔ وہاں ابھی تک ایسے دفاتر، کارخانے اور اجتماعی زراعت کے فارم وغیرہ بھی نہیں ہیں جہاں غیر محرم مرد اور عورتیں کئی کئی گھنٹے تک اپنے گھروں اور گھریلو ماحول سے دُور رہ اور اپنے محارم و اعزّہ کی نگاہوں سے اوجھل ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہیں۔ اس لیے اب تک کی دیہاتی فضا میں عورت گھر سے باہر نکل کر بھی ایک محدود و مانوس دائرے ہی میں رہتی ہے۔ وہ معاشی آزادی کے دلفریب اور مسحور کُن نعرے سے متاثر ہو کر کسی بالکل اجنبی اور دُور دراز مقام پر جا کر غیر محرم مردوں کی ماتحتی اور رفاقت میں تنخواہ پر کام نہیں کرتی بلکہ گھر سے باہر بھی اپنے گھر ہی کا کچھ کام کاج کرتی اور گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ لیکن حقوقِ نسواں کمیٹی کو جو اصل فکر اور پریشانی لاحق ہے وہ یہ ہے کہ "اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین، جو کام کرنے کی خواہشمند ہیں، انہیں دفاتر میں پائے جانے والے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔" چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کی دفعہ ۹۳ کہتی ہے:

> "ملک میں صنعت کے فروغ اور روز افزوں ترقیاتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ عورت کو ایک نمایاں کردار ادا کرنا ہے"۔

یہ نمایاں کردار کیا ہے جو کمیٹی کے بقول پاکستان کی مسلمان عورت کو ادا کرنا ہے؟ اس کی کچھ تفصیل ہمیں رپورٹ کی دفعہ ۹۶ اور دفعہ ۹۷ میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے:

> "جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ گھروں پر عورتوں کی ضرورت سے زیادہ مصروفیات، بالخصوص جب کہ ان کو چھوٹے بچوں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہو، گھروں سے باہر کُل وقتی یا جزو وقتی ملازمت کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور ملک میں سرکاری پرورش گاہوں اور دن کے وقت دیکھ بھال کے مراکز کی عدم موجودگی ان عناصر میں سے ایک ہے جو عورتوں کو ایسی ملازمت کرنے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جن سے وہ اپنی معاشرتی و معاشی حیثیت کو بہتر بنانے میں مدد لے سکتی ہوں۔ اس لیے محنت کش ماؤں کے لیے بچوں کی سرکاری پرورش گاہوں کی اشد ضرورت ہے"۔

مدعا یہ ہے کہ جو خواتین تعلیم یافتہ ہیں اور اس بات کی خواہش مند ہیں، یا جن کے اندر یہ خواہش پیدا کی جائے گی کہ وہ گھروں میں ضرورت سے بڑھ کر مصروف نہ رہیں بلکہ گھر سے باہر نکلیں اور

" کارخانوں، صنعتی اداروں اور تجارتی تنظیموں میں ملازمت" تلاش کریں، تو ایسی صورت میں اگر وہ غیر محرم مردوں کی نظربازی اور ہوا و ہوس کا نشانہ بنیں اور شرعی و اخلاقی حدود و قیود پامال ہوں تو اس کی کوئی فکر حقوق نسواں کمیٹی کو نہیں ہوگی۔ البتہ کمیٹی کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایسی عورتیں اگر ملازمت کے ساتھ ساتھ صاحبِ اولاد بھی ہوجائیں تو بچوں کی نگرانی کون کرے گا؟ کیونکہ ہمارے ملک میں بچوں کے لیے سرکاری پرورش گاہیں اور دیکھ بھال کے مراکز نہیں ہیں جیسا کہ مغربی، بالخصوص اشتراکی ممالک میں موجود ہیں۔ ایسی نرسریوں کی عدم موجودگی عورتوں کی ملازمت میں حوصلہ شکنی کی باعث بنے گی اور ان کی معاشی، اور معاشی سے زیادہ "معاشرتی حیثیت" بہتر نہیں بن سکے گی۔ اس مشکل کا حل کمیٹی نے دفعہ ۹۵ میں یہ تجویز کیا ہے:

" سماجی تحفظِ ملازمین آرڈی ننس ۱۹۶۵ء کے تحت سماجی تحفظ سکیم کے ذریعے تمام شہروں میں سرکاری پرورش گاہوں، دن کے وقت دیکھ بھال کرنے والے مراکز اور نرسریوں کے قیام کے لیے اہتمام کیا جائے۔"

یہ سرکاری پرورش گاہیں یا پبلک نرسریاں جن کے قیام کی تجویز کمیٹی نے پیش کی ہے ان کے لیے انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں "کریش" (CRECHE) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہی لفظ انگریزی رپورٹ میں درج ہے۔ یہ لفظ دراصل کریچ (CRATCH) کی ایک "ترقی یافتہ" صورت ہے، اور کریچ اُس برتن یا ریک وغیرہ کے لیے آتا ہے جو گھر سے باہر پالتو جانوروں کی خوراک، دودھ، پانی وغیرہ کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں چونکہ ڈارون، فرائڈ اور ان کے متبعین نے انسان کو حیوان بلکہ حیوان سے بھی پست تر مخلوق کا درجہ دے رکھا ہے، اس لیے ان کے ہاں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ عین مطلوب ہے کہ دفاتر اور کاروبار کے اجتماعی مراکز میں نر، مادہ، حاملہ، شیر دار سب کو جمع کر کے کام میں جوت دیا جائے، البتہ جو محنت کے قابل نہ رہے اُسے کچھ سستانے کا موقع دیا جائے، اور جس کا بچہ چھوٹا ہو اُس کے بچے کو ایسے دوسرے بچوں کے ساتھ قریب کے کسی باڑے میں بند رکھا جائے اور اُسے کھلانے پلانے کا انتظام کیا جائے، بالکل اُسی طرح جس طرح حیوانات کے چھوٹے بچوں کو ماں سے جدا کر کے رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے کھلانے پلانے کے لیے مستعمل ظرف کا جو نام اہلِ مغرب نے تجویز کیا ہے، وہی انہوں نے ملازم عورتوں

کے دارالاطفال کے لیے پسند کیا ہے اور اُسی نام کو ہماری اس کمیٹی نے اپنایا ہے جو حقوق نسواں کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اس کے بعد ہر مسلمان بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے، بالخصوص ہماری خواتین اس بات کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں، کہ اُنہیں اور ان کی اولادِ صغار کو گھر سے نکال کر کس ماحول اور کس نظام کے حوالے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر اس کا نام آزادی ہے تو یہ وہ آزادی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

مجھے تہذیب مغرب نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

اس حقوق نسواں کمیٹی نے "سرکاری پرورش گاہوں" کے قیام کی سفارش تو بلا تامل کر دی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ان پرورش گاہوں کو دفاتر سے کتنی دُور قائم کیا جائے گا، اُن کی تعداد اور دفاتر اور کارخانوں کی تعداد میں باہمی تناسب کیا ہوگا، ان میں کتنی عمر سے کتنی عمر تک کے بچے رکھے جائیں گے، آیا وہ شبانہ روز یہاں رکھے جائیں گے یا فقط دن یا رات کے وقت رہیں گے، اور ان کی ماؤں اور دوسرے عزیزوں کو ان سے کن اوقات میں کتنی دیر تک ملنے کی اجازت ہوگی؟ شاید کمیٹی کے اکثر ارکان کے دماغ میں اِن سوالات کا کوئی سوچا سمجھا متعین جواب نہ ہوگا بلکہ انہوں نے بھی "کریش" کا لفظ کہیں سے سُن یا پڑھ لیا ہوگا اور "دریں چہ شک" والے طوطے کی طرح اس کو دہرا دیا ہوگا۔ اس لیے ہم ان کی اور دوسرے قارئین کی سہولت اور معلومات کی وسعت کے پیش نظر سوویٹ یونین کی ایسی پرورش گاہوں سے متعلق ایک رپورٹ کے بعض اقتباسات یہاں نقل کیے دیتے ہیں جو "عائلی وجنسی انقلاب" (THE FAMILY AND THE SEXUAL REVOLUTION) نامی کتاب کے باب "یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ (روس) میں ملازم مائیں" سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب انگلستان کے ناشر جارج ایلین اینڈ اَن وِن نے چھاپی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ باب مذکور کے مصنّف نے خود روس جا کر اور وہاں رہ کر حالات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کا نقطہ نظر اس معاملے میں مخالفانہ نہیں بلکہ موافقانہ و ہمدردانہ ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۸۵ تا ۲۹۱ پر مُصنّف نے بچوں کی اجتماعی پرورش گاہوں کے لیے کریش ہی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"دوسرے مغربی ممالک کا ذہن "کریش" کو ایک ناگزیر مگر افسوسناک ضرورت خیال کرتا ہے۔ مگر سوویٹ روس اپنے اشتراکی طرزِ حیات اور اپنے ہاں کے اجتماعی طریق بُود و باش کے لیے ان بچہ گاہوں

کو ایک ایسا پسندیدہ ادارہ قرار دیتا ہے جو سوشلزم کے لوازمات میں سے ہے۔ مغرب میں تربیتِ اطفال کے جو معیارات و نظریات معروف و مسلّم ہیں، یہ چیز اُن کے منافی و مخالف ہے کہ بچوں کی مائیں ملازمت کا پیشہ اختیار کریں۔ لیکن یہ صورتِ حال سوویٹ یونین کے مسلّمہ مقاصد اور مطمحِ نظر کے عین مطابق ہے۔ روسی میگزین "سوویٹ وومین" میں ایک عورت گیلینا کا ایک خط چھپا ہے جس میں وہ کہتی ہے: 'اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آیا میں اپنی ملازمت چھوڑ دینے اور گھریلو فرائض انجام دینے کے لیے تیار ہوں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ میں ایسا نہیں کرسکوں گی۔ فیکٹری میں ہم ایک بڑے خاندان کے ممبر بن گئے ہیں۔ وہاں میرے بہت سے بچے دوست اور بہترین اور مہربان ترین کامریڈ بن چکے ہیں'۔

ایک مثالی سوویٹ کنبے کے جملہ افراد، بوڑھے افراد کے ماسوا، سب کے سب صبح کے وقت ناشتہ کرکے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ماں اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لیتی ہے اور انہیں اس نرسری کے سپرد کر دیتی ہے جو اس کی جائے ملازمت کے پاس ہوتی ہے۔ یہاں ڈاکٹر، نرسیں اور دوسرے خدمت گار بچے کی نگرانی کرتے ہیں۔ ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ضرورت کے وقت بلایا جاسکتا ہے۔ اُسے ہر ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اپنا بنچ یا ڈسک چھوڑنے کی اجازت ہوتی ہے تاکہ وہ جاکر بچے کو دودھ پلاسکے۔ اس کے لیے اُسے آدھ گھنٹے کی چھٹی دی جاتی ہے اور یہ وقت اوقاتِ ملازمت میں شمار ہوتا ہے۔ بیماری کی حالت میں اُسے بچے کی تیمارداری کی اجازت دی جاتی ہے اور تنخواہ نہیں کاٹی جاتی۔

سات گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد ماں جاکر بچہ لیتی ہے اور اُسے گھر لے جاتی ہے[1] جہاں کنبہ دوبارہ یکجا ہوجاتا ہے۔ بچوں کو ان تربیت گاہوں میں کوآپریٹو زندگی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ جن بچوں کی گھروں میں انفرادی تربیت ہو وہ اُس وقت تک نرے سماجی بوجھ ثابت ہوتے ہیں جب

[1] دوسری شائع شدہ معلومات یہ بتاتی ہیں کہ اگر بچہ ماں کا دودھ نہ پیے اور ماں رات کی شفٹ میں کام کرے تو بچہ رات کو بھی گھر نہیں آسکتا۔ اگر والدین رات کو کلب یا دوستوں سے ملنے جائیں تب بھی یہی صورت ہے۔

تک کہ انہیں مساوات پر مبنی زندگی کا عادی نہ کر لیا جائے اور ان کے اندر سے انانیت اور خود غرضی کا خاتمہ نہ کر دیا جائے جو خلوت اور تنہائی کی تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے[1]۔

بچے والی ملازم عورت کو ایک سو بارہ (۱۱۲) ایام کی رخصت ملتی ہے جن میں سے چھپن (۵۶) روز ولادت سے پہلے اور اتنے ہی دن ولادت کے بعد گزارے جاتے ہیں[2]۔ میڈیکل سفارش پر اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ حاملہ اور مرضعہ عورتوں سے اوور ٹائم اور رات کی ڈیوٹی نہیں لی جاتی۔ انہیں ہلکا کام دیا جاتا ہے اور بھاری بوجھ نہیں اٹھوایا جاتا۔ ان کی تنخواہ کم کرنا یا ملازمت سے علیحدہ کرنا خلاف قانون ہے۔ مگر جنسی مساوات کا اصول گھر کے اندر نہیں چلتا۔ سودا سلف خریدنا، کھانا پکانا اور گھر کی صفائی بیشتر عورت ہی کو کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے لیے دفتری اوقات یکساں رکھے گئے ہیں۔ مگر مردوں کے بالمقابل عورتوں کا دگنا وقت سفر اور خرید و فروخت میں اور چوگنا وقت گھریلو کام کاج میں کھپتا ہے۔ اس طرح عورتوں کو آرام، نیند، جسمانی صفائی اور سیاسی مصروفیات کے لیے مردوں سے چار گھنٹے کم وقت ملتا ہے۔ گھر میں ماں اپنے بچے کی نگرانی اور تربیت پر اوسطاً صرف آدھ گھنٹہ روزانہ اور باپ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کرتا ہے۔ عورت گھر کی جھاڑ پونچھ پر یومیہ سوا گھنٹہ اور مرد صرف سولہ منٹ دیتا ہے۔ باورچی خانے میں عورتیں تقریباً ڈھائی گھنٹے روزانہ خرچ کرتی ہیں اور مرد پندرہ منٹ۔"

آخر میں مضمون نگار لکھتا ہے:

"سوویٹ روس میں ملازمت پیشہ ماں پر سے بچوں کی نگرانی کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا ہے مگر امور خانہ داری کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ گویا ملازم ماں کا مسئلہ تو کسی حد تک حل ہوا ہے۔ مگر ملازم

---

[1] مدعا یہ ہے کہ اس فیکٹری میں سے ہر بچہ باٹا کے جوتے کی طرح ایک ہی ذہنی ساخت میں ڈھل کر نکلے اور اس میں کوئی انفرادیت باقی نہ رہے۔

[2] روسی حکومت کی ماسکو سے شائع کردہ کتاب "سوالات و جوابات" (QUESTIONS & ANSWERS) کے صفحہ ۲۸۱ پر بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ بچے والی عورت کو زمانۂ ولادت میں ۱۱۲ دن کی چھٹی ملتی ہے۔ بعد میں کام کے دوران اسے ساڑھے تین گھنٹے کے بعد آدھ گھنٹہ کی رخصت بچے کو دودھ پلانے کے لیے دی جاتی ہے۔

بیوی کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا ۔اس کے برعکس امریکہ میں ملازم بیوی کا مسئلہ ایک حد تک حل ہوگیا ہے مگر ملازم ماں کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے"۔

یہ تو عورتوں کی دفتروں اور فیکٹریوں میں ملازمت اور بچوں کی اجتماعی پرورش کا فقط معاشی اور اقتصادی پہلو ہے جس کا صحیح حساب کتاب اور نفع نقصان اُس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتا جب تک اُن پورے اخراجات کا بھی تخمینہ نہ لگایا جائے جو ان بچہ ساز تربیت خانوں اور ان کے نگرانوں پر قومی خزانے سے صرف ہوں گے ۔لیکن اس مسئلے کا جو پہلو اخلاقی و روحانی ہے وہ تو اس حد تک المناک اور کرب انگیز ہے کہ دماغ کو سوچنے اور قلم کو بیان کرنے کا یارا نہیں ہے ۔تاہم اس سلسلے کے بھی نہایت واشگاف اور رپوست کندہ حالات و نتائج خود مغرب کے مصنفین نے شائع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں نسوانی حقوق کا ڈھونگ اسی طرح رچایا جاتا رہا تو پھر ہم مجبور اً اس دوسرے پہلو پر سے بھی پردہ ہٹا کر دکھائیں گے کہ ایسی اسکیموں کے طفیل نسوانی عصمت اور انسانی غیرت کس بھیانک حشر سے دوچار ہو چکی ہے ۔

اگر اخلاقی پہلو سے تھوڑی دیر کے لیے صرف نظر کر لیا جائے اور محض انسانی زاویۂ نظر ہی کو سامنے رکھا جائے تب بھی مساوات اور عورت کے ساتھ عدل و انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس سے دُہری مشقت لی جائے ۔اُس سے گھر کا کام بھی لیا جائے، اُس پر باہر جا کر کمانے کی ذمہ داری بھی ڈالی جائے اور کمائی کی راہ میں اگر فطری نسوانی مجبوریاں حائل ہوں تو انہیں محض اس قسم کی سطحی اور خلافِ فطرت تدابیر سے حل کرنے کی کوشش کی جائے کہ ملازم خواتین کو حمل و ولادت کے لیے تین یا چار ماہ کی باتنخواہ چھٹی دے دی جائے ۔ اس کے بعد ان کے بچوں کو دفتر سے ملحق نرسری میں ڈال دیا جائے اور جب وہ بھوک سے بلکنے لگیں تو سُرخ جھنڈی ہلا دی جائے اور ماں فوراً دفتر یا فیکٹری سے اُٹھے، جا کر بچے کو دودھ پلائے اور پھر دفتر میں آکر رپورٹ کرے ۔ اس طرح کے انسانی ڈیری فارموں میں جس نسل کی پرورش ہوگی وہ دو ٹانگوں والے اشتراکی یا سرمایہ پرست جانور تو ہو سکتے ہیں مگر وہ شفیق و حلیم انسان اور متقی مسلمان مشکل ہی سے بن سکتے ہیں۔ اسلام نے تو مسلمان خاوند کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے لیے خود کما کر لائے ، اگر بیوی کو طلاق دے تب بھی عدت کے دوران میں مطلقہ کے اخراجات پورے کرے اور چھوٹی اولاد ہو تو ماں کے سپرد ہونے کے باوجود اس کا نان و نفقہ بھی

مہیا کرے۔ لیکن یہ نسوانی حقوق کی کمیٹی عورت کو یہ اُلٹا سبق سکھا رہی ہے کہ وہ جائے اور اجنبی مردوں کی نگرانی اور ہم نشینی میں اپنی معاش خود تلاش کرے۔

یہ کمیٹی بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم عورتوں کو صرف وہ حقوق دلانا چاہتے ہیں جو اسلام نے دیے ہیں مگر مردوں نے چھین لیے ہیں۔ حالانکہ اس کمیٹی کی ہر تجویز مغرب کی بھونڈی اور بے مغز نقالی ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک بلا مبالغہ لاکھوں اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان بے روزگار پھر رہے ہیں۔ عورتوں کا معاشی و معاشرتی مرتبہ بلند و بالا کرنے سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان بے کار مردوں کو کام پر لگایا جائے؟ یہ بھی تو آخر کسی ماں کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی یا کسی بیوی کے خاوند ہو سکتے ہیں۔ انہیں روزگار فراہم کر دینے سے کیا بہت سی بے سہارا خواتین کو آسرا نہیں مل سکتا؟ پھر ان کے معاملے میں بچہ جننے اور پالنے کا جھگڑا بھی نہیں۔ مگر اُن کی فکر اتنی نہیں ہے جتنی "محنت کش ماؤں اور ان کے بچوں کی سرکاری پرورش گاہوں" کی فکر اور پریشانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ترقی یافتہ ممالک میں ہر عہدہ دار اور ہر افسر کے پہلو میں لیڈی سکرٹری براجمان ہے اور ہر دفتر میں مرد کے شانہ بشانہ عورت بیٹھی ہے، مگر ہمارے ہاں ہی ایسی تاریکی ہے کہ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی کسی فیکٹری یا دفتر میں کوئی عورت اور پھر تعلیم یافتہ عورت مشکل ہی سے ملتی ہے۔

حقوق نسواں کمیٹی نے سماجی تحفظِ ملازمین آرڈیننس ۱۹۶۵ء کے علاوہ ۱۹۵۸ء کے ایک آرڈیننس میں بھی ترمیم تجویز کی ہے۔ اس آرڈیننس کا انگریزی عنوان (MATERNITY BENEFITS ORDINANCE) ہے جس کا ترجمہ اُردو رپورٹ میں مغربی پاکستان انتفاعاتِ زچگی آرڈیننس کیا گیا ہے۔ "انتفاعاتِ زچگی" کی ترکیب ناموزوں اور غیر شُستہ ہے۔ اس کے بجائے "مراعاتِ ولادت" یا اس طرح کے دوسرے الفاظ زیادہ مناسب تھے۔ بہرکیف ۱۹۵۸ء کا یہ قانون ان فیکٹریوں پر لاگو ہوتا ہے جو ۱۹۳۴ء کے فیکٹری ایکٹ کے تحت کارخانے شمار ہو سکتے ہیں اور جن میں کم از کم بیس ملازمین کام کرتے ہیں۔ کمیٹی کی خواہش یہ ہے کہ جن صنعتی اور تجارتی اداروں میں دس سے زائد ملازمین موجود ہوں اُن پر بھی ۱۹۵۸ء کے فرمان کا اطلاق کر کے وہاں کی ملازم خواتین کو وہ تمام مراعات دی جائیں جو زچگی، ولادت وغیرہ سے متعلق ۱۹۵۸ء والے قانون میں دی گئی ہیں۔ مگر ارکان کمیٹی کو پھر یاد آیا کہ اس طرح تو زیادہ بچے پیدا ہونے کا خدشہ ہے جس سے منصوبہ بندی والا پروگرام

دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ چنانچہ اس مشکل کا جو حل کمیٹی نے اپنی رپورٹ کی دفعہ ۱۰ا میں پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

"کمیٹی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس امر کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ ایسے صنعتی و تجارتی اداروں میں کام کرنے والی عورتوں کو انتفاعاتِ زچگی کیوں نہ میسر ہوں جہاں پر دس سے زیادہ افراد کام کرتے ہیں۔ تاہم کمیٹی ایسے انتفاعات کو بلا روک ٹوک وسعت دینے سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر اس کے اثرات سے آگاہ ہے۔ اس لیے اس کے خیال میں ایسے انتفاعات تین سے زائد زچگیوں کے لیے نہیں دینے چاہییں۔"

بہتر یہ ہوتا کہ کمیٹی خاندانی منصوبہ بندی کے ذمہ دار حضرات سے بھر اچھی طرح مشورہ کر کے ہدایات لے لیتی، کیونکہ ہمارے خیال میں تو تین بچوں کی یکے بعد دیگرے پیدائش کو نہ صرف گوارا کر لینا بلکہ اس پر عورت کو "انتفاعاتِ زچگی" کی ترغیب و تشویق مہیا کر دینا خاندانی منصوبہ بندی کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہونا تو یہ چاہیے کہ دس سال سے کم میں اگر عورت ایک اور بچے کو جنم دے بیٹھے تو اس پر جرمانہ کیا جائے، یا اس کی تنخواہ کم کر دی جائے، یا کم از کم اسے مراعات سے محروم کر دیا جائے۔ شاید پہلے مرحلے میں کمیٹی نے اتنی دور تک جانا مناسب نہ سمجھا ہو اور اسے دوسرے مرحلے کے لیے اٹھا رکھا ہو۔

حقوق نسواں کمیٹی چونکہ اسلام کا نام بھی بار بار لیتی ہے، اس لیے آخر میں ہم ایک ضروری شرعی مسئلے کی طرف اُسے متوجہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی خاتون کے خاوند کا خدانخواستہ انتقال ہو جائے تو اس پر شرعاً لازم ہے کہ وہ اپنی عدتِ وفات اپنے اور اپنے متوفّٰی شوہر کے گھر میں گزارے اور ضرورت شدید کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔ مروجہ قانون میں اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایسی خاتون اگر ملازم ہو تو اُسے اس عدت کے لیے رخصت دی جائے جس کی مدت غیر حاملہ کے لیے چار ماہ دس دن اور حاملہ کے لیے وضع حمل تک ہے۔ یہ ایک سنگین فروگذاشت ہے۔ ہمارے علم میں بعض ایسی خواتین ہیں جو شرعی حدود و قیود کے ساتھ مثلاً زنانہ درسگاہ میں معلمہ تھیں ۔۔۔ ان کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا ۔۔۔ انہوں نے عدت گزارنے کے لیے رخصت طلب کی مگر صاف انکار کر دیا گیا۔ جس نظامِ حکومت میں بیوہ کا یہ صریح اسلامی حق پامال کیا جا رہا ہے، اس کے اربابِ حل و عقد کس منہ سے اسلامی نسوانی حقوق کی علم برداری کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟

رُوداد ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

[۱۹۶۵ء میں جب سید قطب اور اخوان المسلمون کے دیگر افراد کو جمال عبدالناصر کی حکومت نے گرفتار کیا تھا، اُن میں ایک صاحب احمد رائف بھی تھے جو ۱۹۷۲ء تک جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے اپنے ایام اسیری کے حالات کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ کتاب کا نام " البوابۃ السوداء" (سیاہ دروازہ) ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کا ترجمہ " رودادِ ابتلاء" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ مترجم]

" صرف پانچ منٹ...... ابھی ہم واپس آجائیں گے"۔

میجر محمد عبدالغفار ترک نے مجھے گھر سے گرفتار کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۶۵ء کی صبح کو یہ گرفتاری عمل میں آئی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میجر کا رویہ میرے ساتھ شریفانہ تھا۔ اُس کٹھن دن کا سورج چڑھنے کے ساتھ ہی اُس نے مجھے قلعہ کی حوالات (جس میں سیاسی نظر بند رکھے جاتے ہیں) کے سپرد کر دیا۔

میں امریکی مصنف جان چاپنگ کا ڈرامہ: " آدمی اور چوہے" پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا۔ رات کا ایک بجا چاہتا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ رات کے اس ہولناک سمے میں دستک دینے والے صاحب سمیر الھُضَیبی تھے۔ اُن کا چہرہ پژمُردہ تھا۔ نگاہیں بھٹکی ہوئی تھیں اور وہ سراسیمگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم پاس پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے نئی خبریں سُنانی شروع کر دیں۔ بتانے لگے کہ ہمارے دوست یحیٰی حسین، جو عرب ایر کمپنی میں پائلٹ ہیں، خرطوم کے راستے ادیس ابابا جا رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنا جہاز خرطوم میں اُتارا تو وہاں سے وہ یکایک غائب ہو گئے ہیں —— یہ خبر

سُنتے ہی مجھ پر سراسیمگی چھا گئی۔ میں نے سوچا یہ ہمارا دوست یحییٰ حسین، جس نے زرعی کالج سے فراغت حاصل کی، پھر شہری ہوا بازی کے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوا اور پائلٹ بن گیا۔ اُسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ کالج کی ایک ہم سبق لڑکی کے ساتھ اُس نے شادی کر لی۔ اب اُس کے ہاں دو پیاری سی بچیاں ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام میری یادداشت کے مطابق سمیّہ ہے۔ یہ نوجوان بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ کوئی بات اُس کے عیش کو منغّص کرنے والی نہ تھی۔ میرے علم کے مطابق اُسے کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا......

میں نے سمیر سے پوچھا: یہ خبر آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟ اُس نے جواب دیا: میں اپنے بہنوئی محمد الغنام اور ضیا طوبیچی کے پاس بیٹھا تھا۔ ان لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ میں نے پھر پوچھا کہ: "یحییٰ حسین پر آخر کیا اُفتاد پڑی"؟ سمیر نے مجھے حسرت و اندوہ میں ڈوب کر جواب دیا: مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ لوگ مختلف باتیں اور قیاس آرائیاں کرتے رہے ہیں۔ سب سے انوکھی قیاس آرائی یہ کی گئی ہے کہ سی آئی اے نے اُسے اغوا کرایا ہے۔ کیوں اغوا کرایا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خرطوم ایرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں قہوے کی ایک فنجان پینے کے لیے گیا اور وہاں اُس پر یکایک بیہوشی کا دَورہ پڑ گیا، یا عارضی طور پر اُس کی قوتِ یادداشت مسلوب ہو گئی۔ اب بات نے ایک اور رُخ اختیار کر لیا۔

سمیر نے کہا: یہ بڑی پختہ خبر پھیل رہی ہے کہ حکومت اخوان المسلمون کے لوگوں کو گرفتار کر رہی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ: یحییٰ حسین کی گمشدگی کا کہیں گرفتاریوں کی خبر سے تو تعلق نہیں! بہر حال ہم اِدھر اُدھر کے تیر تُکّے چلاتے رہے۔ اور لاحاصل تجزیے، تاویلیں اور قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ اسی میں صبح کے تین بجنے لگے۔ میرے دوست نے مجھ سے واپس جانے کی اجازت مانگی۔ مجھے یہ تفکّر انگیز خبر سُنا کر وہ چلا گیا اور میں نے اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وٹینگ روم میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے دیکھا کہ وٹینگ روم کی روشنی جل رہی ہے۔ میرا خالہ زاد بھائی رمزی، جس کے ہاں میں رہ رہا ہوں، وہاں کھڑا ہے۔ اور اُس کے چہرے پر دہشت، حیرت اور اضطراب کے آثار طاری ہیں۔ مکان کا دروازہ زور سے بجا۔ رمزی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: "یہ خفیہ پولیس کے لوگ

ہیں۔ اب کیا خیال ہے؟ دروازہ کھول دینے کے سوا اور کیا خیال ہو سکتا تھا۔ نیند آنکھوں سے اڑ گئی۔ پولیس افسر اندر گھُس رہا ہے اور اُس کے سامنے سپاہیوں اور مخبروں کا ایک کا جتھہ ہے جنہوں نے ریوالور تان رکھے ہیں۔ میں حواس باختہ ہو گیا۔ خفیہ پولیس یہاں کیسے۔ یہ کیا چاہتے ہیں۔ کیا ان کی آمد یحییٰ حسین کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چچا ہاشم چوکیدار بھی اندر آ گیا — یہ چوکیدار بھی جو بالائی مصر کا باشندہ ہے، ہماری طرح کچھ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

رمزی نے پولیس افسر سے پوچھا، آپ کون ہیں؟

پولیس افسر: میں ہوں میجر محمد عبدالغفار ترک۔

رمزی: میں آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟

اس سوال پر سپاہیوں اور مخبروں کی ٹولی ہمیں بڑی غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میجر نے کارڈ نکالا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اُسے گردش دی۔ ہم اُس میں سے کوئی چیز نہ پڑھ سکے۔ ہماری نظریں پتھرا چکی تھیں اور کارڈ کی سیاہی اور سفیدی میں تمیز نہ کر رہی تھیں۔ پولیس نے چچا ہاشم کو باہر نکال دیا جو سخت پریشان تھا، اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ دروازہ بند کر دو۔ حیرت زا نگاہوں پر گو خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر وہ اُچک اُچک کر بھی دیکھ رہی تھیں۔ سانس کی بے ترتیبی صاف سُنی جا رہی تھی۔ پولیس افسر کی آواز نے مہرِ سکوت توڑ دی۔ وہ میرا نام لے کر پوچھنے لگا: آپ میں سے احمد رائف کون ہے؟

میں ہوں۔

تمہارا کمرہ کونسا ہے؟

میں نے خاموشی کے ساتھ سامنے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

کمرے کی طرف منہ کر کے وہ کہنے لگا: ہم اس کی تلاشی لے سکتے ہیں؟

رمزی نے اُسے روکنے کی کوشش کی اور تفتیش کے احکام کا مطالبہ کیا۔ پولیس افسر نے ایک تلخ اور تمسخر انگیز مسکراہٹ کے سوا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے رمزی کو اس بے فائدہ کوشش سے روک دیا۔

تلاشی کے لیے ہم سب کمرے میں داخل ہو گئے۔ سپاہی گھر کے کونے کونے کے اندر پھیل گئے۔ میں پولیس افسر سے دریافت کرنے لگا کہ کیا میں اس تمام کارروائی کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟ یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ لوگوں کو کس چیز کی تلاش ہے! میرے ذہن میں یہ مجنونانہ خیال آیا کہ شاید یہ لوگ یحییٰ حسین کی تلاش میں ہیں۔ لیکن اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟ خفیہ پولیس سے اس کا کیا تعلق ہے؟ کیا یہ سب کہانی اخوان کے لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے تو نہیں ہے؟ پولیس افسر کے جواب پر میں چونک پڑا۔ اس کا جواب نہایت شریفانہ لہجے میں تھا: ہم تمہاری کتابوں اور کاغذات پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں طیش میں آگیا۔ کتابیں! میری زندگی کا سب سے مقدس ترین سرمایہ۔ میں نے انہیں نہایت محفوظ مقام پر رکھا ہے۔ انہیں چھیڑنے کی کسی کو اجازت نہیں ہو سکتی ——— مجھے شدید غصہ آیا۔ مگر میں نے اسے پی لیا۔ اور اس وقت غصہ پی لینے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ کتابوں اور کاغذوں کو الٹ پلٹ کیا جاتا رہا۔ انہوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں میں سے ایک نہایت قیمتی ڈھیر چن لیا اور انہیں موٹروں میں رکھ لیا جو نیچے مکان کے سامنے کھڑی تھیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جب ہمارے گاؤں میں میرے چھوٹے بھائی کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے تو وہاں بھی انہوں نے میری کتابوں کے آٹھ صندوق ——— جو میں نے وہاں محفوظ رکھی ہوئی تھیں ——— اٹھا لیے تھے ——— بہرحال تلاشی مکمل ہو گئی۔ میں یہ اندازہ لگانے لگا کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا۔ اتنے میں پولیس افسر بولا:

آپ کپڑے پہن سکتے ہیں؟

کیوں نہیں۔ لیکن کس لیے؟

میجر نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا: بات کچھ نہیں ہے۔ انٹیلی جنس کے دفتر میں معمولی سی پوچھ گچھ ہوگی۔ ہم پانچ منٹ میں واپس آجائیں گے۔ میں نے تامل کرتے ہوئے کہا: رات کے اس آخری حصے میں؟ میجر نے اس بار ذرا شدید لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا: "جی ہاں، رات کے اسی آخری حصے میں"۔

میں سمجھ گیا کہ اب بحث فضول ہے۔ بڑے سکون کے ساتھ میں نے کپڑے پہن لیے اور مکمل سپردگی کے عالم میں میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ گو موسم بڑا گرم تھا مگر نہ معلوم میں نے اُدن کے

بھاری بھر کم کپڑے کیوں پہن لیے۔

گجر دم کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر نیند میں ڈوبے ہوئے قاہرہ کی سڑکیں غیر معمولی سرعت کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ میجر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر مخبروں کے درمیان بیٹھا اپنے انجام پر انگشت بدنداں تھا۔ دو سپاہیوں نے میری باہیں پکڑ لیں گویا اُن میں سے ایک نگران فرشتہ تھا اور دوسرا سائق۔ میرا ذہن طرح طرح کے سوالات سے اُبل رہا تھا۔ ان سوالات کا جواب حاصل کرنے میں مجھے کچھ دیر نہ لگی۔ کیونکہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اُن کا جواب مجھے مل چکا تھا۔ ایک ایسا دن جو میری زندگی کا سب سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرتناک دن تھا۔

خفیہ پولیس کے دفتر میں جب ہم داخل ہوئے تو اُس وقت صبح بڑی سست رفتاری اور اکتاہٹ کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔ پورا دفتر سکوت کے عالم میں غرق تھا۔ بڑا وحشت انگیز دفتر تھا۔ گویا کوئی قبرستان ہے۔ پہلی نظر میں مجھے یہ ماحول ایسا ہی محسوس ہوا۔

مخبروں کے گھیرے میں مَیں گاڑی سے اُترا۔ میجر کے پیچھے پیچھے ہم چل دیے، جس نے قاہرہ کے دوسرے انسانوں کی طرح قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔ شاید سڑک پر چلتے ہوئے سینکڑوں لوگوں کے ہجوم میں آتے جاتے کبھی میرا اُس سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ مگر کیا اُس روز میں یہ تصوّر بھی کر سکتا تھا کہ اِس مرنجاں مرنج شخص کے ہاتھ میں انسانوں کی تقدیریں ہیں ——— جی ہاں یہ وہی مرنجاں مرنج انسان ہے جو کسی شخص کو بھی اُس کے گھر سے جب چاہے پکڑ سکتا ہے اور جہاں چاہے اُسے لے جا سکتا ہے۔ اُس کے لیے صرف ایک چھوٹا سا کارڈ دکھا دینا ہی کافی ہے۔ کارڈ بھی ایسا جسے کوئی شخص اچھی طرح پڑھ نہیں سکتا۔ مگر وہ کارڈ کیا ہے، گویا سلیمانؑ کی انگشتری ہے جس کی تاثیر سے تمام مقفّل دروازے یکایک وا ہو جاتے ہیں۔ یا وہ الٰہ دین کا چراغ ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کارڈ دکھائے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں ٹوک سکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر تلخ حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں مصر کی حالت یہ تھی کہ ہر سرکاری افسر جو چاہے کر سکتا تھا۔ کوئی اُس کا حساب لینے والا یا اُس پر گرفت کرنے والا نہ تھا۔ بلکہ کوئی اُس سے سوال تک کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔

اگر کسی پولیس افسر کا کسی شہری سے کوئی جھگڑا ہے۔ وہ پولیس افسر بڑی آسانی اور بےحد سادگی

کے ساتھ سپاہیوں کی ایک پارٹی سے کہ اُس مسکین کے گھر چلا جائے گا اور اُسے گرفتار کرکے ایسی جگہ پہنچائے گا جہاں اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ اور گرفتار کر لینے کے کئی ماہ بعد اُس کی گرفتاری کا معاملہ ریکارڈ پہ لایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس مسکین کا بیان لے لیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کا کوئی بیان نہ لیا جائے۔ اور وہ سالوں جیل میں سڑتا رہے۔

اُن سنگین ایام میں سب سے زیادہ حیرت انگیز جو صورت پیش آیا کرتی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی شہری جب انکوائری افسر کے سامنے پیش ہوتا تھا تو اُس سے پوچھا جاتا تھا کہ اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی گرفتاری کا خود ہی کوئی وزنی اور معقول سبب بتائے ـــــ ایسا نہ کرنے والے کے لیے عذابِ الیم تھا ـــ جی ہاں، ایسی ہی صورت حال سے انسان گزر رہے تھے۔

بعد میں مجھ پہ جو کچھ گذری اُسی زمانے کی بات ہے کہ میں فوجی جیل میں ملٹری انٹیلی جنس کا مہمان تھا۔ ایک روز دفتر کے باہر اپنی تحقیق کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کو طلب کیا گیا اور متعلقہ افسر کی طرف سے اُس کی گرفتاری کی وجہ پوچھی گئی۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے وجہ معلوم نہیں ـــــ اور وہ بیچارہ واقعی اپنی گرفتاری کی وجہ سے بے خبر تھا ـــــ افسر تحقیق نے تعذیب دینے والے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو ذرا مزہ چکھاؤ۔ چنانچہ پورے آٹھ گھنٹے تک اُسے کبھی کوڑوں سے مارا گیا اور کبھی گرم گرم لوہے کی سلاخوں سے داغا گیا۔ اور وہ بے چارا حقیقت حال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اُسے کوئی ایسا جواب اِلقاء ہو جائے جسے پیش کرکے وہ اس دوزخ سے نجات پا سکے جس کے دروازے یکایک اُس کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ اتنے میں مجھے ایک اور انکوائری افسر کے پاس بھیج دیا گیا۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس بیچارے کے ساتھ کیا گزری۔

ایک اور بدقسمت انسان کی کہانی بھی سن لیجیے۔ یہ ایک ہی عمارت میں ایک فوجی افسر کے پڑوس میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی اور فوجی افسر کی بیوی باہم لڑ پڑیں۔ فوجی افسر نے اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ جب ۱۹۵۴ء میں عام پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو وہ شخص بھی گرفتار کر لیا گیا۔ فوجی افسر کو انتقام لینے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ایک مرتبہ اچانک اُس نے فوجی جیل کے صحن میں اپنے پڑوسی کو دیکھ لیا۔ چنانچہ اس نے متعلقہ ریکارڈ میں اُس کا نام بھی درج کر دیا۔ چند ہی لمحے گذرے تھے کہ اُس شخص کو بھی دوسرے بے شمار نظر بندوں کے ساتھ فوجی ٹرک میں لاد کر فوجی عدالت (جسے پیپلز کورٹ یعنی

عوامی عدالت کہا جاتا تھا بھیج دیا گیا۔ اس کی بدنصیبی میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ اُس روز فوجی عدالت کی طرف سے کسی کارروائی کے بغیر ہی ملزموں کو سزائیں سُنا دی گئیں۔ تمام ملزموں کو خوف و ہراس کی فضا میں دو قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا۔ ایک فوجی سپاہی آیا اور اُس نے ہر قطار کے لوگوں کے نام ایک فہرست میں درج کر لیے۔ اور پھر ایک اور حوالدار آیا اور اُس نے بے ہنگم طریقے سے آوازِ بلند یہ اعلان کیا کہ دائیں بازو والی قطار کے اندر جو لوگ ہیں عدالت نے انھیں دس سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ بائیں بازو والی قطار کے لوگوں کو مزید پانچ سال سزا بھگتنی ہوگی۔ یعنی ۱۵ سال۔ اُس روز یا اُس سے اگلے روز مذکورہ بالا فوجی افسر کا مسکین ہمسایہ لیمان طرہ کی جیل میں ڈال دیا گیا جہاں وہ برسوں جبلِ مقطم کے دامن میں سورج کی شدید تمازت کے اندر پتھر توڑنے کی مشقت سرانجام دیتا رہا۔

خیر........ ہم ۲۵ اگست ۱۹۶۵ء کی صبح کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ میجر اور اس کے جملہ سپاہی پھرتی کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا مگر میرے قدم بھاری ہو رہے تھے۔ میں قلق و اضطراب میں مبتلا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ایسے انجام کی طرف بڑھ رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ اِس وسیع و عریض عمارت کے اندر ایک انسان بھی نظر نہ آرہا تھا۔ کیا یہی انٹیلی جنس کا مرکز ہے جس کا نام سنتے ہی بہادر سے بہادر انسان کا پتّہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔ میں نے میجر کو چیخ کر کہا: تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو۔ اور کیوں لیے جا رہے ہو؟

میجر نے میری چیخ و پکار پر کوئی کان نہ دھرا۔ وہ اب اور ہی انسان بن چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ مجھ سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتا تھا۔ مگر اب اُس کا طرز بدل چکا تھا۔ وہ مجھے دو محافظوں کے حوالے کر کے خود ایک کمرے میں چلا گیا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ خاموش اور مضطرب۔ میرے تصور میں یہ تھا کہ یہ اتنی بڑی بلڈنگ "بے رحم پہرہ داروں" اور "شہاب ثاقب" سے بھری ہوئی ہوگی۔ مگر اب وہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دے رہی تھی۔ تاہم میں سوچ رہا تھا کہ یہ خوفناک سناٹا یقیناً اپنے اندر کوئی بات پنہاں رکھے ہوئے ہے، جس کی تہ کو میں نہیں سمجھ رہا ہوں، اور میری اس وقت کیا حالت ہوگی جب چاروں طرف سے میرے اوپر بلائیں ٹوٹ پڑیں گی۔

میں نے ایک پہرہ دار کو دیکھا کہ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے اُس سے بیخودی کے عالم میں یہ سوال کر ڈالا:

کیا وہاں تعذیب دی جاتی ہے؟

کہاں؟

جہاں تم مجھے لیے جارہے ہو؟

پہرے دار نے مجھے تھکی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا: کیا تم پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے ہو؟ اب بات کھُل کر میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ مگر سبب گرفتاری کیا ہے؟ کچھ نہیں معلوم۔ "گرفتاری" کا لفظ میرے کانوں کے لیے سخت غیر مانوس تھا۔ اب میں نے اس صورت حال کا گہرا جائزہ لینا شروع کیا۔ میجر نے کہا تھا کہ پانچ منٹ میں واپس آنے ہیں۔ مگر اُس کی یہ بات درست نہیں ہے۔ پہرہ دار کی آواز پر میں پھر چونکا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہر حال آپ مت گھبرائیں۔ میں نے کہا: کیوں نہ گھبراؤں؟ کہنے لگا: معمولی مار دی جائے گی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اس پھندے سے میں کیسے نکلوں۔ معمولی مار؟ معمولی مار اور غیر معمولی میں کیا فرق ہے؟ اُس وقت تک میں معمولی مار اور غیر معمولی مار میں فرق نہ کر سکا تھا۔ مگر بعد میں میں سمجھ گیا کہ "معمولی مار" اور "غیر معمولی مار" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آئندہ میں بتاؤں گا کہ یہ کیا فرق ہے۔

میجر جس کمرے میں داخل ہوا تھا مجھے بھی اُسی کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے صبح کی نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مجھے یہ اجازت دے دی گئی۔ میں نے میجر سے قبلے کا رُخ دریافت کیا۔ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے یاد آگیا کہ ایسے موقع پر جس سمت بھی مجھے اطمینان ہو جائے میں نماز پڑھ سکتا ہوں۔

میجر نے اُن تمام کتابوں اور خطوط اور بعض مقالات کی، جو میں نے تاریخ اسلامی کے بارے میں لکھے تھے اور میری جائے قیام سے قبضہ میں لے لیے گئے تھے، ایک فہرست تیار کی۔ پھر مجھے قلم تھماتے ہوئے کہنے لگا کہ اس فہرست پر دستخط کر دو۔ میں نے دیکھا کہ جو کتابیں اُس نے میرے ہاں سے اُٹھائی تھیں ان میں سے اکثر اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔ میں نے کوئی توجہ نہ دی اور پورے سکون اور دلجمعی کے ساتھ اس پر دستخط کر دیے۔ چند منٹوں کے بعد ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے اور

(دیکھیے صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات)
اور انسانوں کے جمہوری حقوق کی بحالی کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور لوگ اُس کے اِس دعوے پر یقین کرتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہو جائیں اور اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو انتخابات میں کامیاب کرائیں ـــــ لیکن جمہوریت کا یہ پرستار جب اقتدار پر قابض ہو جائے تو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تمام آمرانہ اختیارات کے سامنے حکومت کرنے پر مُصر ہو۔ جو لوگ فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ بھی اِس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ وہ ایک فوجی آمر کی حیثیت سے مشہور نہ ہوں۔ اِس لیے وہ اپنے آمرانہ اختیارات کو ایک دستور کی صورت دے لیتے ہیں تاکہ اُنہیں ملک کا آئینی سربراہ کہا جا سکے۔ خود ہمارے ملک میں محمد ایوب خاں فوج کے بل بوتے پر اقتدار میں آئے، لیکن انہوں نے ملک کو ایک دستور دے کر جس میں ان کے وسیع اختیارات کا تحفظ تھا، اپنے آپ کو صدر کہلوانا پسند کیا۔

مگر بھٹو صاحب کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ اُنہیں انتخابات کے راستے مغربی پاکستان میں ایوانِ اقتدار تک رسائی حاصل ہوئی لیکن جس ذریعے سے اُنہیں آئینی سربراہ بننے کا موقع حاصل ہوا تھا اُس کے بنیادی تقاضوں تک کو نظر انداز کر کے وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننے پر بضد ہوئے اور اِسی اندھے بہرے قانون کے تحت مملکت کا نظم و نسق چلانے پر زور دیا۔ اُن کا یہ مطالبہ اگرچہ سراسر غیر معقول تھا لیکن حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حزبِ اختلاف کو اسے ایک مدت تک کے لیے ناچار تسلیم کرنا پڑا۔

مارشل لا کے خاتمہ پر ملک کو جو آئین دیا گیا اُسے دیکھتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہ آئین، ایک شخصیت اور اُس کے غیر محدود اختیارات کو سامنے رکھ کر مُرتب کیا گیا ہے۔ لیکن اِس حقیقت کو پوری طرح جاننے کے باوجود اُسے متفقہ طور پر محض اس لیے قبول کر لیا گیا کہ کسی طرح یہ ملک آمرانہ استبداد سے نجات حاصل کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ پھر اِس کے بعد اُس آئین کا بھٹو صاحب اور اُن کے رفقائے کار نے جس طرح حُلیہ بگاڑا ہے اور اُس میں جمہوریت کی جو کمزور سی رُوح موجود تھی اُسے جس ظالمانہ انداز سے آئین کے جسد سے نکالا ہے وہ بڑی ہی کربناک داستان ہے جس نے لوگوں کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

آمرانہ مزاج اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ جب تشدد پسندانہ رجحانات بھی پرورش

پانے لگیں تو اُن سے عوام پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اُن کا ہر شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ باقی ماندہ نصف پاکستان میں اختلاف کی ہر آواز کو جو شرمناک مظالم ڈھا کر دبا دیا گیا، وہ اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیے جائیں تو وہ بھی ندامت سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق اور دیگر متعدد بے گناہ افراد کی زندگیوں کے چراغ محض رائے کے اختلاف کی بنا پر گل کر دیے گئے۔ سینکڑوں افراد کو اِس جرم بے گناہی کے بدلے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں کہ وہ حاکموں کی ہر بات میں تائید کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور جیلوں کے اندر ان کے ساتھ جو حیا سوز سلوک روا رکھا گیا وہ تاریخ کے سیاہ باب کی حیثیت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

جمہوری ممالک میں جمہوری اداروں خصوصاً اسمبلیوں اور عدالتوں کا تقدس ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ہے، لیکن بھٹو صاحب اور اُن کے رفقاء نے اُن کے تقدس کو پامال کرنے سے قطعاً گریز نہیں کیا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے ارکان کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اُنہیں غنڈہ عناصر کے ذریعے جبری طور پر ایوانوں سے باہر پھنکوایا گیا، وکلاء پر لاٹھی چارج کروایا گیا اور ملک کے عدالتی نظام میں ایسی "اصلاحات" عمل میں لائی گئیں جن سے ایک طرف تو اُن کے اختیارات کا دائرۂ کار محدود ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف اُن کی آزاد حیثیت بہت حد تک متاثر ہوئی۔

پریس کی آزادی جسے کسی ملک میں جمہوریت کے وجود کی سب سے بڑی شہادت سمجھا جاتا ہے، اُس کا جو حشر ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا ہے اُس سے یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔ پاکستان کے قریب قریب سارے اخبارات، (ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر) محض سرکاری خبرنامے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اخبارات صبح و شام بھٹو صاحب کا سیاسی قد کاٹھ بڑھانے اور اُن سے اختلاف کرنے والوں کی کردار کشی میں مصروف رہتے ہیں۔

ووٹ نے بھٹو صاحب کو تختِ اقتدار پر فائز کیا لیکن انہوں نے اپنے جارحانہ طرزِ عمل سے سب سے زیادہ اُس کی تذلیل کر کے اُس کی وقعت عوام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی۔ جس پارٹی کے وہ چیئرمین ہیں اُس میں انتخاب کا اُصول ٹھکرا کر ہائی کمان کی طرف سے مختلف عہدوں کے لیے

میں رکھنے کی کوشش محض خام خیالی ہے ۔ جس طرح ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اسی طرح ہر صاحبِ اقتدار کو مسندِ اقتدار سے محروم ہونا ہی ہے ــــ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کیا یہ طرزِ عمل دانشمندانہ نہیں کہ مقتدر جب یہ دیکھے کہ عوام اُسے مسندِ شاہی پر براجمان نہیں دیکھنا چاہتے تو اُن کے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے اس مسند سے خود بخود الگ ہو جائے اور اس وقت کا انتظار کرے جب عوام اس کے خلاء کو محسوس کرتے ہوئے اُسے عزت و احترام کے ساتھ تختِ اقتدار پر دوبارہ فائز کرنے پر اصرار کریں۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

قاہرہ کی مختلف سڑکیں عبور کر گئے ۔ میجر نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ ہمیں "اوپر" لے چلے ــ یہی لفظ تھے ۔

قلعہ کے برج نمودار ہوئے اور قریب ہوتے گئے ۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں میں یوں جھلکنے لگے جیسے کوئی دیو آسمان کو سینگ مار رہا ہو ۔ نہ معلوم مجھے کیوں اس وقت یہ محسوس ہوا کہ حضرت عمرو بن العاص کی روح میرے سامنے جلوہ افروز ہے ۔ اُس عظیم انسان کی رُوح جس نے مصر کو مشرق کی رومن سلطنت کے مظالم سے نجات دلائی تھی اور اُس عظیم انسان کی برکت سے میں آج مسلمان ہوں ۔ اسی وقت مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اسلام کی رُوح سنگین حالات اور کٹھن آزمائشوں کے باوجود قاہرہ کے در و دیوار پر چھائی رہے گی ۔

گاڑی عجیب و غریب ٹیڑھی اور پیچدار سرنگوں کے اندر سے گزرتی رہی اور میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں اب کوئی عام شخص ادھر اُدھر چلتا نظر نہیں آ رہا تھا ۔ سرنگیں صرف سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں جنہوں نے رائفلیں اُٹھا رکھی تھیں اور ان کی نوکوں پر چمکتی ہوئی سنگینیں آویزاں تھیں۔ انہوں نے سروں پر آہنی خود اوڑھ رکھے تھے ، گویا وہ کہیں جنگ کو جا رہے ہیں ۔ ایک دروازے کے پاس ہم پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئے ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے ساتھیوں کا سلوک اب میرے ساتھ زیادہ سخت ہوتا جا رہا ہے ـــــ ہم ایک ایسی جگہ داخل ہو گئے جیسے ہم کسی پُرانے محل کے اندر کسی قدیم قبر کے اندر داخل ہو رہے ہوں ـــــ ہم دراصل قلعہ کی جیل کے دروازے پر تھے ۔ اسی جیل نے ایسا خون آشام ڈرامہ دیکھا ہے جو عہدِ گذشتہ میں محمد علی پاشا کے خونی ڈراموں سے بھی زیادہ انسانیت سوز تھا ـــــ مجھے یاد ہے کہ اس جیل میں میں نے اگلے ہی روز ایک انسان کی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھائی تھی جو اس خون آشام ڈرامہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا ـــــ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے ۔

(باقی)

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اِس میں مترجم نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں، تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیں

جو حضرات پیشگی روپے روانہ کردیں گے انہیں یہ مترجم و محشی قرآن مجید رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

ھدیہ قسم اعلیٰ	۷۵ روپے
ھدیہ قسم دوم	۶۰ روپے

پیشگی رقم ارسال کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظم ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر ۴۱۰۱۳ — ۴۱۰۱۲